تلخیص

تفہیم القرآن

ترجمہ و تفسیر

سید ابوالاعلیٰ مودودی

تلخیص

مولانا صدر الدین اصلاحیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

چند باتیں

مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیر 'تفہیم القرآن' ہمارے عہد کی معروف ومقبول تفسیر قرآن ہے۔ قرآنِ مجید کے اردو تراجم وتفاسیر کی دنیا میں جو شہرت ومقبولیت تفہیم القرآن کو حاصل ہوئی ہے، وہ معدودے چند ہی کے حصے میں آسکی ہوگی۔ اِس کی اسی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے پیشِ نظر محترم مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے ایما سے انھی کے تربیت یافتہ عالمِ دین مولانا صدر الدین اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی نہایت جامع تلخیص فرمائی تھی۔

تلخیص تفہیم القرآن کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ میں شائع ہوا تھا۔ یہ ایڈیشن ایک جلد میں اور ۱۱۷۵ صفحات پر مشتمل تھا۔ سائز $\frac{۲۳×۳۶}{۸}$ (عرفِ عام میں جہازی) ہونے کی وجہ سے متداول تراجم وتفاسیر کے مقابلے میں بڑا بھی تھا اور وزنی بھی۔ یہ بات شائقین کے لیے باعثِ زحمت تھی۔ اسی کے پیشِ نظر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز نے محترم مولانا سید جلال الدین عمری (امیر جماعت اسلامی ہند، چیرمین ہیومن ویلفیر ٹرسٹ اور چیرمین تصنیفی اکادمی نئی دہلی) کی ہدایت ورہ نمائی کے مطابق موجودہ شکل میں اس کے جدید ایڈیشن کا پروگرام بنایا۔ اس میں قارئین کو درج ذیل تبدیلیاں ملیں گی:

- قدیم ایڈیشن ایک ہی جلد میں ہونے کی وجہ سے دقت طلب تھا، موجودہ ایڈیشن $\frac{۲۰×۳۰}{۸}$ کے چھوٹے سائز پر دو جلدوں میں لایا گیا ہے۔ پہلی جلد سورہ نور پر ختم ہے۔ اس کے بعد کی سورتیں دوسری جلد میں ہیں۔ اس طرح سے دونوں جلدوں کے صفحات میں کافی حد تک یکسانی پیدا ہوگئی ہے۔ اس سے ان شاء اللہ قارئین کو استفادے میں سہولت رہے گی۔
- قدیم ایڈیشن کی کتابت ہاتھ سے کرائی گئی تھی، جس کی وجہ سے یکسانی نہیں ہوسکی تھی۔ موجودہ ایڈیشن، ماہر کمپیوٹر آپریٹروں سے کمپوز کرایا گیا ہے۔ تمام حروف صاف، واضح اور یکساں ہیں۔
- پہلے ایڈیشن میں حروف کافی خفی تھے، جس کی وجہ سے آنکھوں پر کافی زور دینا پڑتا تھا، حواشی بڑی دقت کے ساتھ پڑھنے میں آتے تھے۔ موجودہ ایڈیشن میں اس کمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

- قدیم ایڈیشن میں کتابت کی مخصوص مجبوری کی وجہ سے عربی متن کے نیچے ترجمہ مکمل کرنے کا اہتمام نہیں ہوسکا تھا اور پیراگراف بدلنے کے لیے درمیان ہی میں کھڑی لمبی لکیر (ا) کی علامت لگادی گئی تھی۔ یہ بات غیر سنجیدہ بھی تھی اور عام قارئین کے لیے باعثِ زحمت بھی۔ موجودہ ایڈیشن میں حتی الامکان متعلقہ متن کے نیچے ترجمے کو مکمل کردیا گیا ہے۔ پیراگراف عام معمول کے مطابق نئی سطر ہی سے شروع کیا گیا ہے۔
- قدیم ایڈیشن میں حواشی متعلقہ صفحات میں نہ آسکنے کی وجہ سے یک جا کر کے آخر میں دے دیے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت قاری کے لیے پریشان کن تھی۔ موجودہ ایڈیشن میں بالعموم حواشی متعلقہ صفحات پر ہیں۔ البتہ چند مقامات پر تکنیکی مجبوری کی وجہ سے حواشی اگلے صفحات تک پہنچ گئے، لیکن تسلسل میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا ہے۔
- قدیم ایڈیشن کے آخر میں اشاریہ (فہرست موضوعات) بھی تھا، اسے نئے ایڈیشن کی کسی جلد میں شامل کرنے کی بہ جائے الگ سے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے، تاکہ اشاریے کے شائقین کو استفادے میں سہولت رہے۔

امید ہے کہ تلخیص تفہیم القرآن کا موجودہ ایڈیشن اپنی مختلف تبدیلیوں کی وجہ سے عام و خاص ہر قاری کے لیے مفید اور قابلِ استفادہ ہوگا اور شائقین ہماری اس حقیر کوشش کو بہ نظرِ تحسین دیکھیں گے۔

ناشر

پیش لفظ

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نوراللہ مرقدہٗ کی مشہورِ زمانہ تفسیر ''تفہیم القرآن'' وقت کی ایک بہترین تفسیر ہے۔ یہ تفسیر موجودہ دور کے ذہن کو قرآن حکیم اور اس کے بیان کردہ حقائق اور تعلیمات کے بارے میں جس طرح یقین واطمینان کی ٹھنڈک سے بہرہ ور کرتی ہے، وہ اسی کا حصہ ہے۔ یہ پڑھنے والوں کے اندر صرف قرآن کا فہم ہی نہیں پیدا کرتی، بلکہ طالبانِ حق کو ایمان کی تازگی اور عمل کی سرگرمی بھی عطا کرتی ہے اور ان کے اندر داعیانہ جذبات کو حرکت میں لاتی ہے۔

دین کا مفاد اور اسلام کا دعوتی مزاج تقاضا کرتا ہے کہ ایسی گراں قدر تفسیر کی اشاعت وسیع سے وسیع پیمانے پر ہو اور وہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچے۔ لیکن چوں کہ یہ چھ ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس لیے اس کی افادیت عملاً اتنی نہیں ہوسکتی جتنی ہونی چاہیے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلسِ شوریٰ نے طے کیا کہ اس کی ایک جامع تلخیص تیار کرلی جائے، (چناں چہ) مجلسِ شوریٰ نے یہ نازک اور بھاری ذمہ داری راقم الحروف کے سر ڈالی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُس کے اِس فیصلے کے تحت اور مصنفؒ کی باضابطہ اجازت کے ساتھ، اس نے اپنی بساط بھر پوری احتیاط اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اس کام کو انجام دے دیا ہے۔ دعا ہے کہ اس کی یہ خدمت عنداللہ مقبول ہو اور وہ مقصد پورا ہوتا رہے جسے سامنے رکھ کر یہ کام کیا گیا ہے۔

تلخیص کا طریقہ میں نے یہ اختیار کیا ہے:

(۱) تفہیم القرآن کے حواشی میں جو بہت مختصر قسم کے حواشی ہیں وہ اِس تلخیص میں کسی تخفیف کے بغیر، جوں کے توں، برقرار رکھے گئے ہیں۔ ایسے حواشی کل حواشی کا تقریباً پچپن فی صد حصہ ہیں۔

(۲) اوسط درجے کی طوالت رکھنے والے حواشی میں سے بھی، جو کل حواشی کا تقریباً تیس فی صد حصہ ہیں، کچھ کو ان کی مخصوص اہمیت اور ضرورت کی بنا پر علیٰ حالہٖ باقی رکھا گیا ہے، جب کہ زیادہ تر کو قدرے مختصر کردیا گیا ہے، یعنی ان کے بعض حصوں کو حذف کردیا گیا ہے۔ لیکن اِن حذف کیے ہوئے

حصوں کی نوعیت چونکہ بالعموم صرف تشریحِ مزید کی ہے، اس لیے ان کے حذف کر دیے جانے کے باوجود حواشی کے اصل مضامین میں کوئی قابل لحاظ کمی نہیں پیدا ہو سکی ہے۔

(۳) باقی ماندہ حواشی جو بہت لمبے لمبے ہیں اور تعداد میں کل حواشی کا تقریباً پندرہ فی صد حصہ ہیں، ان میں سے بھی بعض کو بعینہٖ لے لیا گیا ہے اور ان کا کوئی حصہ حذف نہیں کیا گیا ہے۔ ایسا ان کی کسی نہ کسی خاص اہمیت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ باقی کو کافی حد تک مختصر کر دیا گیا ہے۔ یہ بالعموم وہ حواشی ہیں جن میں یا تو فقہی یا تاریخی تفصیلات بیان ہوئی ہیں، یا قرآنی آیات، یا تورات یا انجیل کے یکے بعد دیگرے کئی کئی حوالے دیے گئے ہیں، یا پھر ان کے مضامین کہیں پہلے دوسرے حواشی میں گزر چکے ہیں۔

(۴) مختصر کیے ہوئے حواشی دو طرح کے ہیں: ایک قسم تو اُن حواشی کی ہے جو حذف و اختیار کے بعد بھی تمام تر مصنفؒ کے اپنے ہی الفاظ پر مشتمل برقرار ہیں۔ ان میں میں نے کسی طرح کا کوئی اضافہ اپنی طرف سے نہیں کیا ہے۔ دوسری قسم ان حواشی کی ہے جن میں کسی نہ کسی جگہ ایک دو لفظ یا ایک آدھ جملے میرے اپنے بڑھائے ہوئے ہیں۔ اس اضافے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ان حواشی کے بعض حصے حذف کر دیے جانے کے بعد باقی ماندہ عبارتیں مربوط نہیں رہ جاتی تھیں۔ ان کی اس بے ربطی کو دور کرنے کے لیے یہ اضافے ناگزیر تھے۔

(۵) مصنفؒ نے تفہیم القرآن کی تکمیل اور اشاعت کے بعد، اِدھر اپنے آخری دورِ حیات میں ''ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' کے نام سے قرآن مجید کا جو ترجمہ تھوڑے سے مختصر ترین تفسیری حواشی کے ساتھ علیحدہ سے ایک مجلد میں شائع کیا تھا، اس کے حواشی اگرچہ تفہیم القرآن ہی کے حواشی کا اختصار ہیں، لیکن اس میں انہوں نے کچھ حواشی بالکل نئے سرے سے بھی لکھے ہیں، جو تفہیم القرآن میں نہیں تھے۔ اور نہ اب بھی ہیں۔ میں نے موصوفؒ کے منشا کے مطابق اپنی اس تلخیص میں ان نئے حواشی کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔

(۶) سورۂ نساء، آیت ۳ کے پہلے فقرے (وَاِنْ خِفْتُمْ .... ثُلٰثَ وَرُبٰعَ) کے ترجمے پر جو تفسیری حاشیہ مصنفؒ نے ''ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' میں تحریر فرمایا ہے، وہ تفہیم القرآن کے حاشیے

سے قدرے مختلف رنگ کا ہے۔ اور صرف یہی ایک مقام ہے، جہاں دونوں کے تفسیری حاشیے ایک دوسرے سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہیں۔ چونکہ ان دونوں حواشی میں سے ایک کو لے لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا میرے لیے صحیح نہ ہوتا، اس لیے تلخیص میں میں نے دونوں ہی کو درج کر دیا ہے۔ پہلے تفہیم القرآن والے حاشیے کو، پھر دوسرے حاشیے کو۔ اور صورتِ حال کو واضح کر دینے کے لیے اس دوسرے حاشیے کو ایک توضیحی نوٹ کے ساتھ اس طرح ﴿ ﴾ کے بریکٹ کے اندر کر دیا۔

(۷) مصنف علاّمؒ نے ''ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' میں دینے کے لیے تفہیم القرآن کے حواشی کو صرف مختصر ہی نہیں کیا ہے بلکہ ان میں سے کچھ کے اندر تھوڑی بہت لفظی ترمیمات بھی کی ہیں۔ چونکہ ان ترمیموں کی حیثیت واضح طور پر نظرِ ثانی شدہ اور اصلاح یافتہ مسودۂ تحریر کی ہے، اس لیے میں نے 'تلخیص' میں تفہیم القرآن کی اصل عبارتوں کی بجائے انہی بدلی ہوئی عبارتوں کو لیا ہے۔

(۸) جہاں تک قرآن مجید کے ترجمے کا تعلق ہے، اگرچہ تفہیم القرآن ہی کا ترجمہ ''ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' میں بھی دیا گیا ہے، لیکن کہیں کہیں چھوٹی موٹی لفظی ترمیموں کے ساتھ دیا گیا ہے۔ چونکہ ان ترمیموں کی حیثیت بھی اصلاح کی ہے، اس لیے 'تلخیص' میں تفہیم القرآن سے قرآن کا ترجمہ لیتے وقت ان ترمیموں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ 'تلخیص' میں ترجمۂ قرآن کی کتابت وہ کرائی گئی ہے، جو ''ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' میں ہے۔ البتہ بعض آیتوں کا معاملہ اس سے مستثنیٰ ہے۔ اس استثنا کی وجہ یہ ہوئی کہ تفہیم القرآن میں اِن آیتوں کے ترجموں پر جو دو لفظی حاشیے دیے گئے ہیں، ''ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' میں انہیں حاشیے کے طور پر دینے کی بجائے مصنفؒ نے ترجمے کے متن ہی کے اندر بریکٹ میں دے دیا ہے۔ اب اگر 'تلخیص' کے اندر اس طریقے کی پیروی کی جاتی تو پھر ان آیتوں کے ترجمے پر تفہیم القرآن میں قائم کیے ہوئے حاشیے یہاں ساقط کر دینے پڑتے اور یہ بات اُس التزام کے خلاف ہوتی، جسے میں نے تفہیم القرآن کے حواشی کے بارے میں پوری شدّت سے ملحوظ رکھا ہے۔ یعنی یہ کہ 'تلخیص' میں 'تفہیم القرآن' کا کوئی ایک حاشیہ بھی لے لیے جانے سے کلیتہً چھوٹنے نہ پائے۔

'تلخیص' کی کتابت میں درج ذیل باتوں کا اہتمام ملحوظ رکھا گیا ہے:

(۱) قرآن کریم کے ترجمے کی کتابت چوں کہ ضرورتاً زیرِ متن کرائی گئی ہے، اس لیے اس میں معروف طریقے پر پیراگراف قائم نہیں کیے جاسکتے تھے۔ حالاں کہ مصنفؒ کے نزدیک بجاطور پر اس پیراگرافنگ کی بڑی اہمیت تھی۔ اس لیے اس کے لیے ایک مخصوص طریقہ اختیار کرنا پڑا اور وہ یہ کہ مصنفؒ نے اپنے ترجمۂ قرآن میں جہاں جہاں نئے پیراگراف قائم کیے ہیں، وہاں وہاں کتابت کراتے وقت اس ''ا'' طرح کی کھڑی لائنیں لگوادی گئیں۔ لہٰذا ترجمہ میں جہاں کہیں اس طرح کی چھوٹی سی کھڑی لائن نظر آئے وہاں سمجھ لینا چاہیے کہ یہاں سے نیا پیراگراف شروع ہوتا ہے۔

(۲) 'تلخیص' میں کہیں کہیں میرے اپنے بعض الفاظ یا ایک آدھ جملے کا جو اضافہ ہے، اس کی کتابت اِس { } طرح کے بریکٹ کے اندر کرائی گئی ہے، تاکہ میرے بڑھائے ہوئے الفاظ مصنف علامؒ کے الفاظ سے بالکل الگ اور ممیّز رہیں۔

(۳) 'تلخیص' میں مصنفؒ کے نئے لکھے ہوئے جو حواشی ''ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' سے لے کر درج کیے گئے ہیں، وہ ذیلی نمبر لگا کر درج کیے گئے ہیں: مثلاً اگر تفہیم القرآن کے کسی حاشیے کا نمبر ۶ تھا اور اس کے بعد کسی نئے لکھے ہوئے حاشیے کا اضافہ کرنا ہوا تو اس پر [۶الف] کا نمبر لگادیا گیا ہے۔

(۴) ''ترجمۂ قرآن مجید مع مختصر حواشی'' سے لے کر اس تلخیص میں جن نئے حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے، اُن کی بھی اور جن ترمیم شدہ اور اصلاح یافتہ عبارتوں کو لیا گیا ہے اُن کی بھی کتابت مسلسل، یعنی کسی علامتِ فارقہ کے اندراج کے بغیر کرائی گئی ہے۔ کیونکہ یہ نئے حواشی اور یہ ترمیم شدہ عبارتیں دونوں چیزیں حضرت مصنفؒ کی اپنی ہی ہیں، نہ کہ کسی اور کی۔ اس لیے انہیں کسی مخصوص علامت کے ذریعے ممیّز کردینے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں تھی۔ تفہیم القرآن میں ان کے موجود نہ ہونے کے باوجود حقیقتاً انہیں تفہیم ہی کے اجزاء سمجھنا چاہیے۔

قارئین کرام 'تلخیص تفہیم القرآن' کا مطالعہ کرتے وقت ان ساری باتوں کو ضرور سامنے رکھیں۔

اللہ تعالیٰ اس کتاب کو ہم سب کے لیے نافع بنائے۔ (آمین)

---

۶ ربیع الاوّل ۱۴۰۱ھ / ۱۳ جنوری ۱۹۸۱ صدرالدین اصلاحی

دیباچہ

قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر پر ہماری زبان میں اب تک اتنا کام ہو چکا ہے کہ اب کسی شخص کا محض برکت و سعادت کی خاطر ایک نیا ترجمہ یا ایک نئی تفسیر شائع کر دینا وقت اور محنت کا کوئی صحیح مصرف نہیں ہے۔ اس راہ میں مزید کوشش اگر معقول ہو سکتی ہے تو صرف اس صورت میں جب کہ آدمی کسی ایسی کسر کو پورا کر رہا ہو جو سابق مترجمین ومفسرین کے کام میں رہ گئی ہو، یا طالبین قرآن کی کسی ایسی ضرورت کو پورا کرے جو پچھلے تراجم وتفاسیر سے پوری نہ ہوتی ہو۔

ان صفحات میں ترجمانی وتفہیم قرآن کی جو سعی کی گئی ہے وہ دراصل اسی بنیاد پر ہے۔ میں ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ ہمارے عام تعلیم یافتہ لوگوں میں روح قرآن تک پہنچنے اور اس کتاب پاک کے حقیقی مدعا سے روشناس ہونے کی جو طلب پیدا ہو گئی ہے اور روز بروز بڑھ رہی ہے وہ مترجمین ومفسرین کی قابل قدر مساعی کے باوجود ہنوز تشنہ ہے۔ اس کے ساتھ میں یہ احساس بھی اپنے اندر پا رہا تھا کہ اس تشنگی کو بجھانے کے لیے کچھ نہ کچھ خدمت میں بھی کر سکتا ہوں۔ انہی دونوں احساسات نے مجھے اس کوشش پر مجبور کیا، جس کے ثمرات ہدیۂ ناظرین کیے جا رہے ہیں۔ اگر فی الواقع میری یہ حقیر پیش کش لوگوں کے لیے فہم قرآن میں کچھ بھی مددگار ثابت ہوئی تو یہ میری بہت بڑی خوش نصیبی ہوگی۔

اس کام میں میرے پیش نظر علماء اور محققین کی ضروریات نہیں ہیں، اور نہ ان لوگوں کی ضروریات ہیں جو عربی زبان اور علوم دینیہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد قرآن مجید کا گہرا تحقیقی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے حضرات کی پیاس بجھانے کے لیے بہت کچھ سامان پہلے سے موجود ہے۔ میں جن لوگوں کی خدمت کرنا چاہتا ہوں وہ اوسط درجے کے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو عربی سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں اور علوم قرآن کے وسیع ذخیرے سے استفادہ کرنا جن کے لیے ممکن نہیں ہے۔ انہی کی ضروریات کو میں نے پیش نظر رکھا ہے۔ اس وجہ سے بہت سے ان تفسیری مباحث کو میں نے سرے سے ہاتھ ہی نہیں لگایا جو علم تفسیر میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں مگر اس طبقے کے لیے غیر ضروری ہیں۔ پھر جو مقصد میں نے اس کام میں اپنے سامنے رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ایک عام ناظر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے قرآن کا مفہوم و مدعا بالکل صاف صاف سمجھتا چلا جائے اور اس سے وہی اثر قبول کرے جو قرآن اس پر ڈالنا چاہتا ہے۔ نیز دوران مطالعہ جہاں جہاں اسے الجھنیں پیش آ سکتی ہوں وہ صاف کر دی جائیں اور جہاں کچھ سوالات اس کے ذہن میں پیدا ہوں ان کا جواب اسے بروقت مل جائے۔ یہ میری کوشش ہے۔ اب اس امر کا فیصلہ عام ناظرین ہی کر سکتے ہیں کہ میں اس میں

کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔ بہرحال یہ حرف آخر نہیں ہے۔ ہر ناظر سے میری درخواست ہے کہ جہاں کوئی تشنگی محسوس ہو، یا کسی سوال کا جواب نہ ملے، یا مدعا اچھی طرح واضح نہ ہو رہا ہو، اس سے مجھے مطلع کیا جائے تا کہ میں اس خدمت کو زیادہ سے زیادہ مفید بنا سکوں۔ علماء کرام سے بھی میں گزارش کرتا ہوں کہ مجھے میری غلطیوں سے آگاہ فرمائیں۔

چند الفاظ ترجمانی و تفہیم کے متعلق بھی

میں نے اس کتاب میں ترجمے کا طریقہ چھوڑ کر آزاد ترجمانی کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں پابندیِ لفظ کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ کرنے کو غلط سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ جہاں تک ترجمۂ قرآن مجید کا تعلق ہے، یہ خدمت اس سے پہلے متعدد بزرگ بہترین طریقہ پر انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں اب کسی مزید کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہی ہے۔ فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کا ترجمہ، اور اردو میں شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب، مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا اشرف علی صاحب اور حافظ فتح محمد صاحب جالندھری کے تراجم ان اغراض کو بخوبی پورا کر دیتے ہیں جن کے لیے ایک لفظی ترجمہ درکار ہوتا ہے۔ لیکن کچھ ضرورتیں ایسی ہیں جو لفظی ترجمہ سے پوری نہیں ہوتیں اور نہیں ہو سکتیں۔ انہی کو میں نے ترجمانی کے ذریعے سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

لفظی ترجمے کا اصل فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو قرآن کے ہر ہر لفظ کا مطلب معلوم ہو جاتا ہے اور وہ ہر آیت کے نیچے اس کا ترجمہ پڑھ کر جان لیتا ہے کہ اس آیت میں یہ کچھ فرمایا گیا ہے۔ لیکن اس فائدے کے ساتھ اس طریقے میں کئی پہلو نقص کے بھی ہیں جن کی وجہ سے ایک غیر عربی داں ناظر قرآن مجید سے اچھی طرح مستفید نہیں ہو سکتا۔

پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمے کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانیِ عبارت، زور بیان، بلاغت زبان اور تاثیر کلام کا فقدان ہے۔ قرآن کی سطروں کے نیچے آدمی کو ایک ایسی بے جان عبارت ملتی ہے جسے پڑھ کر نہ اس کی روح وجد میں آتی ہے، نہ اس کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں، نہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے ہیں، نہ اس کے جذبات میں کوئی طوفان برپا ہوتا ہے، نہ اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی چیز عقل و فکر کو تسخیر کرتی ہوئی قلب و جگر تک اترتی چلی جا رہی ہے۔ اس طرح کا کوئی تأثر رونما ہونا تو درکنار، ترجمے کو پڑھتے وقت تو بسا اوقات آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ کیا واقعی یہی وہ کتاب ہے، جس کی نظیر لانے کے لیے دنیا بھر کو چیلنج دیا گیا تھا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظی ترجمے کی چھلنی صرف دوا کے خشک اجزاء ہی کو اپنے اندر سے گزرنے دیتی ہے۔ رہی ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ جو قرآن کی اصل عبارت میں بھری ہوئی ہے، اس کا کوئی حصہ ترجمے میں شامل نہیں ہونے پاتا۔ وہ اس چھلنی کے اوپر ہی سے اڑ جاتی ہے۔ حالانکہ قرآن کی تاثیر میں اس کی پاکیزہ تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے، اس کے ادب کا حصہ

بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل بھی پگھلا دیتی تھی۔ جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح عرب کی ساری زمین ہلا دی تھی۔ جس کی قوت تاثیر کا لوہا اس کے شدید ترین مخالفین تک مانتے تھے اور ڈرتے تھے کہ یہ جادو اثر کلام جو سنے گا وہ بالآخر نقد دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی اور وہ اسی طرح کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جیسی اس کے ترجموں میں ہم کو ملتی ہے تو اہل عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں اسے ہرگز وہ کامیابی نہ حاصل ہو سکتی جو فی الواقع اسے حاصل ہوئی۔

لفظی ترجموں سے طبائع کے پوری طرح متأثر نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعموم بین السطور درج کیے جاتے ہیں، یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک طرف کلام اللہ اور دوسری طرف ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ یہ طریقہ اس غرض کے لیے تو عین مناسب ہے جس کی خاطر آدمی لفظی ترجمہ پڑھتا ہے، کیونکہ اس طرح ہر لفظ اور ہر آیت کے مقابلے میں اس کا ترجمہ ملتا جاتا ہے۔ لیکن ان کا نقصان یہ ہے کہ ایک آدمی جس طرح دوسری کتابوں کو پڑھتا اور ان سے اثر قبول کرتا ہے، اس طرح وہ ترجمۂ قرآن مجید کو نہ تو مسلسل پڑھ سکتا ہے اور نہ اس سے اثر قبول کر سکتا ہے، کیونکہ بار بار ایک اجنبی زبان کی عبارت اس کے مطالعے کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہے۔ انگریزی ترجموں میں اس سے بھی زیادہ بے اثری پیدا کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ بائبل کے ترجمے کی پیروی میں قرآن کی ہر آیت کا ترجمہ الگ الگ نمبر وار درج کیا جاتا ہے۔ آپ کسی بہتر سے بہتر مضمون کو لے کر ذرا اس کے فقرے فقرے کو الگ کر دیجیے اور اوپر نیچے نمبر وار لکھ کر اسے پڑھیے۔ آپ کو خود محسوس ہو جائے گا کہ مربوط اور مسلسل عبارت سے جو اثر آپ کے ذہن پر پڑتا تھا اس سے آدھا اثر بھی ان جدا جدا فقروں کے پڑھنے سے نہیں پڑتا۔

ایک اور وجہ، اور بڑی اہم وجہ لفظی ترجمے کے غیر مؤثر ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کا طرز بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ اگر اس کو منتقل کرتے وقت تقریر کی زبان کو تحریر کی زبان میں تبدیل نہ کیا جائے اور جوں کا توں اس کا ترجمہ کر ڈالا جائے تو ساری عبارت غیر مربوط ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ قرآن مجید ابتداءً لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیا گیا تھا، بلکہ دعوت اسلامی کے سلسلے میں حسب موقع وضرورت ایک تقریر نبی ﷺ پر نازل کی جاتی تھی اور آپ اسے ایک خطبے کی شکل میں لوگوں کو سناتے تھے۔ تقریر کی زبان اور تحریر کی زبان میں فطرتاً بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ مثلاً تحریر میں ایک شبہ کو بیان کر کے اسے رفع کیا جاتا ہے۔ مگر تقریر میں شبہ کرنے والے خود سامنے موجود ہوتے ہیں، اس لیے بسا اوقات یہ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ ''لوگ ایسا کہتے ہیں'' بلکہ مقرر آمد سخن ہی میں ایک فقرہ ایسا کہہ جاتا ہے جو ان کے شبہ کا جواب ہوتا ہے۔ تحریر میں سلسلۂ کلام سے الگ مگر اس سے قریبی تعلق رکھنے والی کوئی بات کہنی ہو تو اس کو جملۂ معترضہ کے طور پر کسی نہ کسی طرح عبارت سے جدا کر کے لکھا جاتا ہے تاکہ ربط کلام ٹوٹنے نہ پائے۔ لیکن تقریر میں صرف لہجہ اور طرز خطاب بدل کر ایک مقرر بڑے بڑے جملہ ہائے معترضہ بولتا

چلا جاتا ہے اور کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔ تحریر میں بیان کا تعلق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں، ان کے درمیان کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا۔ تقریر میں متکلم اور مخاطب بار بار بدلتے ہیں۔ مقرر اپنے زورِ کلام میں موقع و محل کے لحاظ سے کبھی ایک ہی گروہ کا ذکر بصیغۂ غائب کرتا ہے اور کبھی اسے حاضر سمجھ کر براہ راست خطاب کرتا ہے۔ کبھی واحد کا صیغہ بولتا ہے اور کبھی جمع کے صیغے استعمال کرنے لگتا ہے۔ کبھی متکلم وہ خود ہوتا ہے، کبھی کسی گروہ کی طرف سے بولتا ہے، کبھی کسی بالائی طاقت کی نمائندگی کرنے لگتا ہے اور کبھی وہ بالائی طاقت خود اس کی زبان سے بولنے لگتی ہے۔ تقریر میں یہ چیز ایک حسن پیدا کرتی ہے، مگر تحریر میں آ کر یہی چیز بے جوڑ ہو جاتی ہے۔ یہی وجوہ ہیں کہ جب کسی تقریر کو تحریر کی شکل میں لایا جاتا ہے تو اس کو پڑھتے وقت آدمی لازماً ایک طرح کی بے ربطی محسوس کرتا ہے اور یہ احساس اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے جتنا اصل تقریر کے حالات اور ماحول سے آدمی دور ہوتا جاتا ہے۔ خود قرآن عربی میں بھی ناواقف لوگ جس بے ربطی کی شکایت کرتے ہیں، اس کی اصلیت یہی ہے۔ وہاں تو اس کو دور کرنے کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ تفسیری حواشی کے ذریعے سے ربطِ کلام کو واضح کیا جائے، کیونکہ قرآن کی اصل عبارت میں کوئی کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ لیکن کسی دوسری زبان میں قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے اگر تقریر کی زبان کو احتیاط کے ساتھ تحریر کی زبان میں تبدیل کر لیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ یہ بے ربطی دور ہو سکتی ہے۔

علاوہ بریں، جیسا کہ ابھی میں اشارتاً عرض کر چکا ہوں، قرآن مجید کی ہر سورت دراصل ایک تقریر تھی جو دعوت اسلامی کے کسی مرحلے میں ایک خاص موقعے پر نازل ہوتی تھی۔ اس کا ایک خاص پس منظر ہوتا تھا۔ کچھ مخصوص حالات اس کا تقاضا کرتے تھے۔ اور کچھ ضرورتیں ہوتی تھیں جنھیں پورا کرنے کے لیے وہ اترتی تھی۔ اپنے اس پس منظر اور اپنی اس شانِ نزول کے ساتھ قرآن کی ان سورتوں کا تعلق اتنا گہرا ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے مجرد الفاظ کا ترجمہ آدمی کے سامنے رکھ دیا جائے تو بہت سی باتوں کو وہ قطعاً نہیں سمجھے گا، اور بعض باتوں کو الٹا سمجھ جائے گا، اور قرآن کا پورا مدعا تو شاید کہیں اس کی گرفت میں آئے گا ہی نہیں۔ قرآن عربی کے معاملے میں اس مشکل کو دور کرنے کے لیے تفسیر سے مدد لینی پڑتی ہے، کیونکہ اصل قرآن میں کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن دوسری زبان میں ہم اتنی آزادی برت سکتے ہیں کہ قرآن کی ترجمانی کرتے وقت کلام کو کسی نہ کسی حد تک اس کے پس منظر اور اس کے حالاتِ نزول کے ساتھ جوڑتے چلے جائیں، تاکہ ناظر کے لیے وہ پوری طرح بامعنی ہو سکے۔

پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ قرآن اگرچہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ وہ اپنی ایک مخصوص اصطلاحی زبان بھی رکھتا ہے۔ اس نے بکثرت الفاظ کو ان کے اصل لغوی معنی سے ہٹا کر ایک خاص معنی میں استعمال کیا ہے، اور بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو وہ مختلف مواقع پر مختلف مفہومات میں استعمال کرتا ہے۔ پابندیِ لفظ کے ساتھ

جو ترجمے کیے جاتے ہیں ان میں اس اصطلاحی زبان کی رعایت ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہے، اور اس کے ملحوظ نہ رہنے سے بسا اوقات ناظرین طرح طرح کی الجھنوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک لفظ کفر کو لیجیے جو قرآن کی اصطلاح میں اصل عربی لغت اور ہمارے فقہا و متکلمین کی اصطلاح دونوں سے مختلف معنی رکھتا ہے، اور پھر خود قرآن میں بھی ہر جگہ ایک ہی معنی میں استعمال نہیں ہوا ہے۔ کہیں اس سے مراد مکمل غیر ایمانی حالت ہے۔ کہیں یہ مجرد انکار کے معنی میں آیا ہے۔ کہیں اس سے محض ناشکری اور احسان فراموشی مراد لی گئی ہے۔ کہیں مقتضیات ایمان میں سے کسی کو پورا نہ کرنے پر کفر کا اطلاق کیا گیا ہے۔ کہیں اعتقادی اقرار مگر عملی انکار یا نافرمانی کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے۔ کہیں ظاہری اطاعت مگر باطنی بے اعتقادی کو کفر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان مختلف مواقع پر اگر ہم ہر جگہ کفر کا ترجمہ کفر ہی کرتے چلے جائیں، یا اور کسی لفظ کا التزام کر لیں، تو بلا شبہ ترجمہ اپنی جگہ صحیح ہوگا لیکن ناظرین کہیں مطلب سے محروم رہ جائیں گے، کہیں کسی غلط فہمی کے شکار ہوں گے، اور کہیں خلجان میں پڑ جائیں گے۔

لفظی ترجمے کے طریقے میں کسر اور خامی کے یہی وہ پہلو ہیں جن کی تلافی کرنے کے لیے میں نے ''ترجمانی'' کا ڈھنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے اس میں قرآن کے الفاظ کو اردو کا جامہ پہنانے کے بجائے یہ کوشش کی ہے کہ قرآن کی ایک عبارت کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے دل پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان صحت کے ساتھ اپنی زبان میں منتقل کر دوں۔ اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربی مبین کی ترجمانی اردوئے مبین میں ہو، تقریر کا ربط فطری طریقے سے تحریر کی زبان میں ظاہر ہو، اور کلام الٰہی کا مطلب و مدعا صاف صاف واضح ہونے کے ساتھ اس کا شاہانہ وقار اور زور بیان بھی جہاں تک بس چلے ترجمانی میں منعکس ہو جائے۔ اس طرح کے آزاد ترجمے کے لیے یہ تو بہر حال ناگزیر تھا کہ لفظی پابندیوں سے نکل کر ادائے مطالب کی جسارت کی جائے، لیکن معاملہ کلام الٰہی کا تھا، اس لیے میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ہی یہ آزادی برتی ہے۔ جس حد تک احتیاط میرے امکان میں تھی، اس کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اس امر کا پورا اہتمام کیا ہے کہ قرآن کی اپنی عبارت جتنی آزادیِ بیان کی گنجائش دیتی ہے اس سے تجاوز نہ ہونے پائے۔

پھر چونکہ قرآن کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ارشادات کا پس منظر بھی آدمی کے سامنے ہو، اور یہ چیز ترجمانی میں پوری طرح نمایاں نہیں کی جا سکتی تھی، اس لیے میں نے ہر سورے کے آغاز میں ایک دیباچہ لکھ دیا ہے جس میں اپنی حد تک پوری تحقیق کر کے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ وہ سورہ کس زمانے میں نازل ہوئی، اس وقت کیا حالات تھے، اسلام کی تحریک کس مرحلے میں تھی، کیا اس کی ضروریات تھیں اور کیا مسائل اس وقت درپیش تھے۔ نیز جہاں کہیں کسی خاص آیت یا مجموعۂ آیات کی کوئی الگ شان نزول ہے وہاں میں نے اسے حاشیے میں بیان کر دیا ہے۔

حواشی میں میری انتہائی کوشش یہ رہی ہے کہ کوئی ایسی بحث نہ چھیڑی جائے جو ناظر کی توجہ قرآن سے ہٹا کر کسی دوسری چیز کی طرف پھیر دے۔ جتنے حاشیے بھی میں نے لکھے ہیں دو ہی قسم کے مقامات پر لکھے ہیں۔ ایک وہ جہاں مجھے محسوس ہوا کہ ایک عام ناظر اس جگہ تشریح چاہے گا، یا اس کے ذہن میں کوئی سوال پیدا ہوگا، یا وہ کسی شبہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ دوسرے وہ جہاں مجھے اندیشہ ہوا کہ ناظر اس جگہ سے سرسری طور پر گزر جائے گا اور قرآن کے ارشاد کی اصل روح اس پر واضح نہ ہوگی۔

جو لوگ اس کتاب سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیں ان کو میں مشورہ دوں گا کہ پہلے ہر سورۃ کے دیباچے کو بغور پڑھ لیا کریں اور جب تک وہ سورۃ ان کے زیر مطالعہ رہے، وقتاً فوقتاً اس کے دیباچے پر نظر ڈالتے رہیں۔ پھر روزانہ قرآن مجید کا جتنا حصہ وہ معمولاً پڑھتے ہوں اس کی ایک ایک آیت کا لفظی ترجمہ پہلے پڑھ لیں۔ اس غرض کے لیے فارسی، اردو، انگریزی تراجم میں سے جس کو وہ چاہیں منتخب کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد تفہیم القرآن کی ترجمانی کو حواشی کی طرف توجہ کیے بغیر مسلسل ایک عبارت کے طور پر پڑھیں تاکہ قرآن کے اس حصے کا پورا مضمون بیک وقت ان کے سامنے آ جائے۔ پھر ایک ایک آیت کو تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لیے حواشی کا مطالعہ کریں۔ اس طرح پڑھنے سے مجھے توقع ہے کہ ایک عام ناظر کو قرآن مجید کی عالمانہ واقفیت نہ سہی، عامیانہ واقفیت ان شاء اللہ بخوبی حاصل ہو جائے گی۔

اس کتاب کو میں نے محرم ۱۳۶۱ھ (فروری ۱۹۴۲) میں شروع کیا تھا۔ پانچ سال سے زیادہ مدت تک اس کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ سورۂ یوسفؑ کے آخر تک ترجمانی اور تفہیم تیار ہوگئی۔ اس کے بعد پے در پے ایسے اسباب پیش آتے چلے گئے کہ مجھے نہ تو آگے کچھ لکھنے کا موقع مل سکا اور نہ اتنی فرصت ہی میسر آ سکی کہ جتنا کام ہو چکا تھا، اسی کو نظر ثانی کر کے اس قابل بنا سکتا کہ کتابی صورت میں شائع ہو سکے۔ اب اسے حسن اتفاق کہیے یا سوء اتفاق کہ اکتوبر ۱۹۴۸ میں یکایک مجھے پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا اور یہاں مجھ کو وہ فرصت بہم پہنچ گئی، جو اس کتاب کو پریس میں جانے کے قابل بنانے کے لیے درکار تھی۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جس غرض کے لیے میں نے یہ محنت کی ہے، وہ پوری ہو اور یہ کتاب قرآن مجید کے فہم میں بندگان خدا کے لیے واقعی کچھ مددگار ثابت ہو سکے،

وَمَاتَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔

ابوالاعلیٰ

نیو سنٹرل جیل ــــــــــ ملتان

۱۷ ذی القعدہ ۱۳۶۸ھ (۱۱ ستمبر ۱۹۴۹)

مقدمہ

ان گزارشوں کے عنوان میں لفظ ''مقدمہ'' دیکھ کر کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں قرآن کا مقدمہ لکھ رہا ہوں۔ یہ قرآن کا نہیں تفہیم القرآن کا مقدمہ ہے، اور اس کے لکھنے سے میرے پیش نظر دو مقصد ہیں:

اوّل یہ کہ قرآن کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے ایک عام ناظر ان باتوں سے اچھی طرح واقف ہو جائے جن کو ابتدا ہی میں سمجھ لینے سے فہم قرآن کی راہ آسان ہو جاتی ہے، ورنہ یہ باتیں دوران مطالعہ میں بار بار کھٹکتی ہیں اور بسا اوقات محض ان کو نہ سمجھنے کی وجہ سے آدمی برسوں تک معانی قرآن کی سطح ہی پر گھومتا رہتا ہے، گہرائی میں اترنے کا راستہ اسے نہیں ملتا۔

دوم یہ کہ ان سوالات کا جواب پہلے ہی دے دیا جائے جو قرآن کو سمجھنے کی کوشش کرتے وقت بالعموم لوگوں کے ذہن میں پیدا ہوا کرتے ہیں۔ میں اس مقدمہ میں صرف ان سوالات کا جواب دوں گا جو خود میرے ذہن میں اوّل اوّل پیدا ہوئے تھے، یا جن سے بعد میں مجھ کو سابقہ پیش آیا۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سوالات بھی جواب طلب باقی رہ گئے ہوں تو ان سے مجھے آگاہ کیا جائے۔ ان کا جواب ان شاء اللہ آئندہ اشاعت کے موقعے پر اس مقدمہ میں بڑھا دیا جائے گا۔

عام طور پر ہم جن کتابوں کے پڑھنے کے عادی ہیں، ان میں ایک متعین موضوع پر معلومات، خیالات اور دلائل کو ایک خاص تصنیفی ترتیب کے ساتھ مسلسل بیان کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر جب ایک ایسا شخص جو قرآن سے ابھی تک اجنبی رہا ہے، پہلی مرتبہ اس کتاب کے مطالعے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ یہ توقع لیے ہوئے آگے بڑھتا ہے کہ ''کتاب'' ہونے کی حیثیت سے اس میں بھی عام کتابوں کی طرح پہلے موضوع کا تعین ہوگا، پھر اصل مضمون کو ابواب اور فصول میں تقسیم کر کے ترتیب وار ایک ایک مسئلے پر بحث کی جائے گی، اور اسی طرح زندگی کے ایک ایک شعبے کو بھی الگ الگ لے کر اس کے متعلق احکام و ہدایات سلسلہ وار درج ہوں گی۔ لیکن جب وہ کتاب کھول کر مطالعہ شروع کرتا ہے تو یہاں اسے اپنی توقع کے بالکل خلاف ایک دوسرے ہی انداز بیان سے سابقہ پیش آتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل ناآشنا تھا۔ یہاں وہ دیکھتا ہے کہ اعتقادی مسائل، اخلاقی ہدایات، شرعی احکام، دعوت، نصیحت، عبرت، تنقید، ملامت، تخویف، بشارت، تسلی، دلائل، شواہد، تاریخی قصے، آثار کائنات کی طرف اشارے، بار بار ایک دوسرے کے بعد آ رہے ہیں۔ ایک ہی مضمون مختلف طریقوں سے مختلف الفاظ میں دہرایا جا رہا ہے۔ ایک مضمون کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا اچانک شروع جاتا ہے، بلکہ ایک مضمون کے بیچ میں دوسرا مضمون یکایک آ جاتا ہے۔ مخاطب اور متکلم بار بار

بدلتے ہیں اور خطاب کا رخ رہ رہ کر مختلف سمتوں میں پھرتا ہے۔ بابوں اور فصلوں کی تقسیم کا کہیں نشان نہیں۔ تاریخ ہے تو تاریخ نگاری کے انداز میں نہیں۔ فلسفہ و مابعد الطبیعیات ہیں تو منطق و فلسفہ کی زبان میں نہیں۔ انسان اور موجودات عالم کا ذکر ہے تو علوم طبیعی کے طریقے پر نہیں۔ تمدن و سیاست اور معیشت و معاشرت کی گفتگو ہے تو علوم عمران کے طرز پر نہیں۔ قانونی احکام اور اصول قانون کا بیان ہے تو مقننوں کے ڈھنگ سے بالکل مختلف۔ اخلاق کی تعلیم ہے تو فلسفۂ اخلاق کے سارے لٹریچر سے اس کا انداز جدا۔ یہ سب کچھ اپنے سابق کتابی تصور کے خلاف پا کر آدمی پریشان ہو جاتا ہے اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ ایک غیر مرتب، غیر مربوط، منتشر کلام ہے جو اوّل سے لے کر آخر تک بے شمار چھوٹے بڑے مختلف شذرات پر مشتمل ہے، مگر مسلسل عبارت کی شکل میں لکھ دیا گیا ہے۔ مخالفانہ نقطۂ نظر سے دیکھنے والا اسی پر طرح طرح کے اعتراضات کی بنا رکھ دیتا ہے۔ اور موافقانہ نقطۂ نظر رکھنے والا کبھی معنی کی طرف سے آنکھیں بند کر کے شکوک سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کبھی اس ظاہری بے ترتیبی کی تاویلیں کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتا ہے، کبھی مصنوعی طریقے سے ربط تلاش کر کے عجیب عجیب نتائج نکالتا ہے، اور کبھی ''نظریۂ شذرات'' کو قبول کر لیتا ہے جس کی وجہ سے ہر آیت اپنے سیاق و سباق سے الگ ہو کر ایسی معنی آفرینیوں کی آماج گاہ بن جاتی ہے جو قائل کے منشا کے خلاف ہوتی ہیں۔

پھر ایک کتاب کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پڑھنے والے کو اس کا موضوع معلوم ہو، اس کے مقصد و مدّعا اور اس کے مرکزی مضمون کا علم ہو، اس کے انداز بیان سے واقفیت ہو، اس کی اصطلاحی زبان اور اس کے مخصوص طرز تعبیر سے شناسائی ہو، اور اس کے بیانات اپنی ظاہری عبارت کے پیچھے جن احوال و معاملات سے تعلق رکھتے ہوں وہ بھی نظر کے سامنے رہیں۔ عام طور پر جو کتابیں ہم پڑھتے ہیں ان میں یہ چیزیں آسانی مل جاتی ہیں اس لیے ان کے مضامین کی تہ تک پہنچنے میں ہمیں کوئی بڑی زحمت نہیں ہوتی۔ مگر قرآن میں یہ اس طرح نہیں ملتیں جس طرح ہم دوسری کتابوں میں انہیں پانے کے عادی رہے ہیں۔ اس لیے ایک عام کتاب خواں کی سی ذہنیت لے کر جب ہم میں کا کوئی شخص قرآن کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو اسے کتاب کے موضوع، مدعا اور مرکزی مضمون کا سراغ نہیں ملتا، اس کا انداز بیان اور طرز تعبیر بھی اسے کچھ اجنبی سا محسوس ہوتا ہے، اور اکثر مقامات پر اس کی عبارات کا پس منظر بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ متفرق آیات میں حکمت کے جو موتی بکھرے ہوئے ہیں ان سے کم و بیش مستفید ہونے کے باوجود آدمی کلام اللہ کی اصلی روح تک پہنچنے سے محروم رہ جاتا ہے اور علم کتاب حاصل کرنے کے بجائے اس کو کتاب کے محض چند منتشر نکات و فوائد پر قناعت کر لینی پڑتی ہے۔ بلکہ اکثر لوگ جو قرآن کا مطالعہ کر کے شبہات میں مبتلا ہو جاتے ہیں ان کے بھٹکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فہم کتاب کے ان ضروری مبادی سے ناواقف رہتے ہوئے جب وہ قرآن کو پڑھتے ہیں تو اس کے صفحات پر مختلف مضامین انہیں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں، بکثرت آیات کا مطلب ان پر نہیں کھلتا، بہت سی آیات کو دیکھتے ہیں کہ بجائے خود نور حکمت سے جگمگا رہی ہیں مگر سیاق عبارت میں بالکل بے جوڑ محسوس ہوتی ہیں، متعدد مقامات پر تعبیرات اور اسلوب بیان کی ناواقفیت انہیں اصل مطلب سے ہٹا

کر کسی اور ہی طرف لے جاتی ہے، اور اکثر مواقع پر پس منظر کا صحیح علم نہ ہونے سے شدید غلط فہمیاں پیش آتی ہیں۔

قرآن کس قسم کی کتاب ہے؟ اس کے نزول کی کیفیت اور اس کی ترتیب کی نوعیت کیا ہے؟ اس کا موضوع گفتگو کیا ہے؟ اس کی ساری بحث کس مدّعا کے لیے ہے؟ کس مرکزی مضمون کے ساتھ اس کے یہ بے شمار مختلف النوع مضامین وابستہ ہیں؟ کیا طرز استدلال اور کیا طرز بیان اس نے اپنے مدعا کے لیے اختیار کیا ہے؟ یہ اور ایسے ہی دوسرے چند ضروری سوالات ہیں جن کا جواب صاف اور سیدھے طریقے سے اگر آدمی کو ابتدا ہی میں مل جائے تو وہ بہت سے خطرات سے بچ سکتا ہے اور اس کے لیے فہم و تدبر کی راہیں کشادہ ہو سکتی ہیں۔ جو شخص قرآن میں تصنیفی ترتیب تلاش کرتا ہے اور وہاں اسے نہ پا کر کتاب کے صفحات میں بھٹکنے لگتا ہے، اس کی پریشانی کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ مطالعۂ قرآن کے ان مبادی سے ناواقف ہوتا ہے۔ وہ اس گمان کے ساتھ مطالعہ شروع کرتا ہے کہ وہ ''مذہب کے موضوع پر ایک کتاب'' پڑھنے چلا ہے۔ ''مذہب کا موضوع'' اور ''کتاب''، ان دونوں کا تصور اس کے ذہن میں وہی ہوتا ہے جو بالعموم ''مذہب'' اور ''کتاب'' کے متعلق ذہنوں میں پایا جاتا ہے۔ مگر جب وہاں اسے اپنے ذہنی تصور سے بالکل ہی مختلف ایک چیز سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ اپنے آپ کو اس سے مانوس نہیں کر سکتا اور سررشتۂ مضمون ہاتھ نہ آنے کے باعث بین السطور یوں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے جیسے وہ ایک اجنبی مسافر ہے جو کسی نئے شہر کی گلیوں میں کھو گیا ہے۔ اس گم گشتگی سے وہ بچ جائے اگر اسے پہلے ہی یہ بتا دیا جائے کہ تم جس کتاب کو پڑھنے جا رہے ہو وہ تمام دنیا کے لٹریچر میں اپنے طرز کی ایک ہی کتاب ہے، اس کی ''تصنیف'' دنیا کی ساری کتابوں سے بالکل مختلف طور پر ہوئی ہے، اپنے موضوع اور مضمون اور ترتیب کے لحاظ سے بھی وہ ایک نرالی چیز ہے، لہٰذا تمہارے ذہن کا وہ ''کتابی'' سانچہ جو اب تک کی کتب بینی سے بنا ہے، اس کتاب کے سمجھنے میں تمہاری مدد نہ کرے گا بلکہ الٹا مزاحم ہوگا۔ اسے سمجھنا چاہتے ہو تو اپنے پہلے سے قائم کیے ہوئے قیاسات کو ذہن سے نکال کر اس کی عجیب خصوصیات سے شناسائی حاصل کرو۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ناظر کو قرآن کی اصل سے واقف ہو جانا چاہیے۔ وہ خواہ اس پر ایمان لائے یا نہ لائے، مگر اس کتاب کو سمجھنے کے لیے اسے نقطۂ آغاز کے طور پر اس کی وہی اصل قبول کرنی ہوگی جو خود اس نے اور اس کے پیش کرنے والے (محمد ﷺ) نے بیان کی ہے۔ اور وہ یہ ہے:

۱- خداوند عالم نے، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک اور فرماں روا ہے، اپنی بے پایاں مملکت کے اس حصے میں، جسے زمین کہتے ہیں، انسان کو پیدا کیا۔ اسے جاننے اور سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں دیں۔ بھلائی اور برائی کی تمیز دی۔ انتخاب اور ارادے کی آزادی عطا کی۔ تصرف کے اختیارات بخشے۔ اور فی الجملہ ایک طرح کی خود اختیاری (Autonomy) دے کر اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا۔

۲- اس منصب پر انسان کو مقرر کرتے وقت خداوند عالم نے اچھی طرح اس کے کان کھول کر یہ بات اس کے ذہن نشین کر دی تھی کہ تمہارا اور تمام جہان کا مالک، معبود اور حاکم میں ہوں۔ میری اس سلطنت میں نہ تم خود مختار ہو،

نہ کسی دوسرے کے بندے ہو، اور نہ میرے سوا کوئی تمہاری اطاعت و بندگی اور پرستش کا مستحق ہے۔ دنیا کی یہ زندگی جس میں تمہیں اختیارات دے کر بھیجا جا رہا ہے دراصل تمہارے لیے ایک امتحان کی مدت ہے جس کے بعد تمہیں میرے پاس واپس آنا ہوگا اور میں تمہارے کام کی جانچ کر کے فیصلہ کروں گا کہ تم میں سے کون امتحان میں کامیاب رہا ہے اور کون ناکام۔ تمہارے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ مجھے اپنا واحد معبود اور حاکم تسلیم کرو۔ جو ہدایت میں بھیجوں اس کے مطابق دنیا میں کام کرو، اور دنیا کو دارالامتحان سمجھتے ہوئے اس شعور کے ساتھ زندگی بسر کرو کہ تمہارا اصل مقصد میرے آخری فیصلے میں کامیاب ہونا ہے۔ اس کے برعکس تمہارے لیے ہر وہ رویہ غلط ہے جو اس سے مختلف ہو۔ اگر پہلا رویہ اختیار کرو گے (جسے اختیار کرنے کے لیے تم آزاد ہو) تو تمہیں دنیا میں امن و اطمینان حاصل ہوگا اور جب میرے پاس پلٹ کر آؤ گے تو میں تمہیں ابدی راحت و مسرت کا وہ گھر دوں گا جس کا نام جنت ہے۔ اور اگر دوسرے کسی رویہ پر چلو گے (جس پر چلنے کے لیے بھی تم کو آزادی ہے) تو دنیا میں تم کو فساد اور بے چینی کا مزا چکھنا ہوگا اور دنیا سے گزر کر عالم آخرت میں جب آؤ گے تو ابدی رنج و مصیبت کے اس گڑھے میں پھینک دیے جاؤ گے جس کا نام دوزخ ہے۔

۳- یہ فہمائش کر کے مالک کائنات نے نوع انسانی کو زمین میں جگہ دی اور اس نوع کے اوّلین افراد (آدم اور حوّا) کو وہ ہدایت بھی دے دی جس کے مطابق انہیں اور ان کی اولاد کو زمین میں کام کرنا تھا۔ یہ اوّلین انسان جہالت اور تاریکی کی حالت میں پیدا نہیں ہوئے تھے بلکہ خدا نے زمین پر ان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں کیا تھا۔ وہ حقیقت سے واقف تھے۔ انہیں ان کا قانون حیات بتا دیا گیا تھا۔ ان کا طریق زندگی خدا کی اطاعت (اسلام) تھا، اور وہ اپنی اولاد کو یہی بات سکھا کر گئے کہ وہ مطیع خدا (مسلم) بن کر رہیں۔ لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ انسان اس صحیح طریق زندگی (دین) سے منحرف ہو کر مختلف قسم کے غلط رویوں کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے غفلت سے اس کو گم بھی کیا اور شرارت سے اس کو مسخ بھی کر ڈالا۔ انہوں نے خدا کے ساتھ زمین و آسمان کی مختلف انسانی اور غیر انسانی، خیالی اور مادی ہستیوں کو خدائی میں شریک ٹھیرا لیا۔ انہوں نے خدا کے دیے ہوئے علم حقیقت (العلم) میں طرح طرح کے اوہام اور نظریوں اور فلسفوں کی آمیزش کر کے بے شمار مذاہب پیدا کر لیے۔ انہوں نے خدا کے مقرر کیے ہوئے عادلانہ اصول اخلاق و تمدن (شریعت) کو چھوڑ کر یا بگاڑ کر اپنی خواہشات نفس اور اپنے تعصّبات کے مطابق ایسے قوانین زندگی گھڑ لیے جن سے خدا کی زمین ظلم سے بھر گئی۔

۴- خدا نے جو محدود خود اختیاری انسان کو دی تھی اس کے ساتھ یہ بات مطابقت نہ رکھتی تھی کہ وہ اپنی تخلیقی مداخلت سے کام لے کر ان بگڑے ہوئے انسانوں کو زبردستی صحیح رویے کی طرف موڑ دیتا۔ اور اس نے دنیا میں کام کرنے کے لیے جو مہلت اس نوع کے لیے اور اس کی مختلف قوموں کے لیے مقرر کی تھی اس کے ساتھ یہ بات بھی مطابقت نہ رکھتی تھی کہ اس بغاوت کے رونما ہوتے ہی وہ انسانوں کو ہلاک کر دیتا۔ پھر جو کام ابتدائے آفرینش سے اس نے اپنے ذمہ لیا تھا وہ یہ تھا کہ انسان کی خود اختیاری کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی مہلت عمل کے دوران میں، اس کی

رہنمائی کا انتظام وہ کرتا رہے گا۔ چنانچہ اپنی اس خود عائد کردہ ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے اس نے انسانوں ہی میں سے ایسے آدمیوں کو استعمال کرنا شروع کیا جو اس پر ایمان رکھنے والے اور اس کی رضا کی پیروی کرنے والے تھے۔ اس نے ان کو اپنا نمائندہ بنایا۔ اپنے پیغامات ان کے پاس بھیجے۔ ان کو علم حقیقت بخشا۔ انہیں صحیح قانون حیات عطا کیا۔ اور انہیں اس کام پر مامور کیا کہ بنی آدم کو اسی راہ راست کی طرف پلٹنے کی دعوت دیں جس سے وہ ہٹ گئے تھے۔

۵- یہ پیغمبر مختلف قوموں اور ملکوں میں اٹھتے رہے۔ ہزارہا برس تک ان کی آمد کا سلسلہ چلتا رہا۔ ہزارہا کی تعداد میں وہ مبعوث ہوئے۔ ان سب کا ایک ہی دین تھا، یعنی وہ صحیح رویہ جو اوّل روز ہی انسان کو بتا دیا گیا تھا۔ وہ سب ایک ہی ہدایت کے پیرو تھے، یعنی اخلاق وتمدن کے وہ ازلی وابدی اصول جو آغاز ہی میں انسان کے لیے تجویز کر دیے گئے تھے۔ اور ان سب کا ایک ہی مشن تھا، یعنی یہ کہ اس دین اور اس ہدایت کی طرف اپنے ابنائے نوع کو دعوت دیں، پھر جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں ان کو منظّم کر کے ایک ایسی امت بنائیں جو خود اللہ کے قانون کی پابند ہو اور دنیا میں قانون الٰہی کی اطاعت قائم کرنے اور اس قانون کی خلاف ورزی روکنے کے لیے جدوجہد کرے۔ ان پیغمبروں نے اپنے اپنے دور میں اپنے اس مشن کو پوری خوبی کے ساتھ ادا کیا، مگر ہمیشہ یہی ہوتا رہا کہ انسانوں کی ایک کثیر تعداد تو ان کی دعوت قبول کرنے پر آمادہ ہی نہ ہوئی اور جنہوں نے اسے قبول کر کے امت مسلمہ کی حیثیت اختیار کی وہ رفتہ رفتہ خود بگڑتے چلے گئے حتیٰ کہ ان میں سے بعض امّتیں ہدایت الٰہی کو بالکل ہی گم کر بیٹھیں، اور بعض نے خدا کے ارشادات کو اپنی تحریفات اور آمیزشوں سے مسخ کر دیا۔

۶- آخر کار خداوند عالم نے سرزمین عرب میں محمد ﷺ کو اسی کام کے لیے مبعوث کیا جس کے لیے پچھلے انبیاء آتے رہے تھے۔ ان کے مخاطب عام انسان بھی تھے اور پچھلے انبیاء کے بگڑے ہوئے پیرو بھی۔ سب کو صحیح رویے کی طرف دعوت دینا، سب کو از سر نو خدا کی ہدایت پہنچا دینا اور جو اس دعوت و ہدایت کو قبول کریں انہیں ایک ایسی امت بنا دینا ان کا کام تھا جو ایک طرف خود اپنی زندگی کا نظام خدا کی ہدایت پر قائم کرے اور دوسری طرف دنیا کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرے۔ اسی دعوت اور ہدایت کی کتاب یہ قرآن ہے جو اللہ نے محمد ﷺ پر نازل فرمائی۔

قرآن کی یہ اصل معلوم ہو جانے کے بعد ناظرین کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اس کتاب کا موضوع کیا ہے، اس کا مرکزی مضمون کیا ہے، اور اس کا مدعا کیا ہے۔

اس کا موضوع انسان ہے اس اعتبار سے کہ بہ لحاظ حقیقت نفس الامری اس کی فلاح اور اس کا خسران کس چیز میں ہے۔

اس کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ ظاہر بینی یا قیاس آرائی یا خواہش کی غلامی کے سبب سے انسان نے خدا اور نظام کائنات اور اپنی ہستی اور اپنی دنیوی زندگی کے متعلق جو نظریات قائم کیے ہیں، اور ان نظریات کی بنا پر جو رویے اختیار کر لیے ہیں وہ سب حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے غلط اور نتیجے کے اعتبار سے خود انسان ہی کے لیے تباہ کن ہیں۔ حقیقت وہ ہے جو انسان کو خلیفہ بناتے وقت خدا نے خود بتا دی تھی۔ اور اس حقیقت کے لحاظ سے انسان کے لیے

وہی رویہ درست اور خوش انجام ہے جسے پچھلے صفحات میں ہم ''صحیح رویے'' کے نام سے بیان کر چکے ہیں۔

اس کا مدعا انسان کو اس صحیح رویہ کی طرف دعوت دینا اور اللہ کی اس ہدایت کو واضح طور پر پیش کرنا ہے جسے انسان اپنی غفلت سے گم اور اپنی شرارت سے مسخ کرتا رہا ہے۔

ان تین بنیادی امور کو ذہن میں رکھ کر کوئی شخص قرآن کو دیکھے تو اسے صاف نظر آئے گا کہ یہ کتاب کہیں اپنے موضوع اور اپنے مدّعا اور مرکزی مضمون سے بال برابر بھی نہیں ہٹی ہے۔ اوّل سے لے کر آخر تک اس کے مختلف النوع مضامین اس کے مرکزی مضمون کے ساتھ اس طرح جڑے ہوئے ہیں جیسے ایک ہار کے چھوٹے بڑے رنگ برنگ جواہر ہار کے رشتے میں مربوط و منسلک ہوتے ہیں۔ وہ زمین و آسمان کی ساخت پر، انسان کی خلقت پر، آثار کائنات کے مشاہدات اور گزری ہوئی قوموں کے واقعات پر گفتگو کرتا ہے، مختلف قوموں کے عقائد و اخلاق اور اعمال پر تنقید کرتا ہے، مابعد الطبیعی امور و مسائل کی تشریح کرتا ہے، اور بہت سی دوسری چیزوں کا ذکر بھی کرتا ہے، مگر اس لیے نہیں کہ اسے طبیعیات یا تاریخ یا فلسفے یا کسی اور فن کی تعلیم دینی ہے، بلکہ اس لیے کہ اسے حقیقت نفس الامری کے متعلق انسان کی غلط فہمیاں دور کرنی ہیں، اصل حقیقت لوگوں کے ذہن نشین کرنی ہے، خلاف حقیقت رویے کی غلطی و بدانجامی واضح کرنی ہے، اور اس رویے کی طرف دعوت دینی ہے جو مطابق حقیقت اور خوش انجام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر چیز کا ذکر صرف اس حد تک اور اس انداز میں کرتا ہے جو اس کے مدعا کے لیے ضروری ہے، ہمیشہ ان چیزوں کا ذکر بقدر ضرورت کرنے کے بعد غیر متعلق تفصیلات کو چھوڑ کر اپنے مقصد اور مرکزی مضمون کی طرف رجوع کرتا ہے، اور اس کا سارا بیان انتہائی یکسانی کے ساتھ ''دعوت'' کے محور پر گھومتا رہتا ہے۔

مگر قرآن کے طرز بیان اور اس کی ترتیب اور اس کے بہت سے مضامین کو آدمی اس وقت تک اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا جب تک کہ وہ اس کی کیفیت نزول کو بھی اچھی طرح نہ سمجھ لے۔

یہ قرآن اس نوعیت کی کتاب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت اسے لکھ کر محمد ﷺ کو دے دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ اسے شائع کر کے لوگوں کو ایک خاص رویۂ زندگی کی طرف بلائیں۔ نیز یہ اس نوعیت کی کتاب بھی نہیں ہے کہ اس میں مصنّفانہ انداز پر کتاب کے موضوع اور مرکزی مضمون کے متعلق بحث کی گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں نہ تصنیفی ترتیب پائی جاتی ہے اور نہ کتابی اسلوب۔ دراصل اس کی نوعیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کے شہر مکہ میں اپنے ایک بندے کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور اسے حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتدا کرے۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں:

ایک، پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کس طرز پر کام کریں۔

دوسرے، حقیقت نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں ان غلط فہمیوں کی مجمل

تردید جو گردوپیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے ان کا رویہ غلط ہو رہا تھا۔

تیسرے صحیح رویے کی طرف دعوت اور ہدایت الٰہی کے ان بنیادی اصول اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح وسعادت ہے۔

شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے جن کی زبان نہایت شستہ، نہایت شیریں، نہایت پر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی تاکہ دلوں میں یہ بول تیر ونشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود ان کے ترنم کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہوں، اور زبانیں ان کے حسن تناسب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انہیں دہرانے لگیں۔ پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جارہی تھیں عالمگیر صداقتیں مگر ان کے لیے دلائل وشواہد اور مثالیں اس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں جس سے مخاطب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ انہی کی تاریخ، انہی کی روایات، انہی کے روزمرہ مشاہدہ میں آنے والے آثار اور انہی کی اعتقادی واخلاقی اور اجتماعی خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

دعوت کا یہ ابتدائی مرحلہ تقریباً چار پانچ سال تک جاری رہا، اور اس مرحلے میں نبی ﷺ کی تبلیغ کا ردعمل تین صورتوں میں ظاہر ہوا:

(۱) چند صالح آدمی اس دعوت کو قبول کر کے امت مسلمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔

(۲) ایک کثیر تعداد جہالت یا خودغرضی یا آبائی طریقے کی محبت کے سبب سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔

(۳) مکے اور قریش کی حدود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں پہنچنے لگی۔

یہاں سے اس دعوت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اسلام کی اس تحریک اور پرانی جاہلیت کے درمیان ایک سخت جاں گسل کشمکش برپا ہوئی جس کا سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ نہ صرف مکے میں، نہ صرف قبیلۂ قریش میں، بلکہ عرب کے بیشتر حصوں میں بھی جو لوگ پرانی جاہلیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے وہ اس تحریک کو بزور مٹا دینے پر تل گئے۔ انہوں نے اسے دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ جھوٹا پروپیگنڈا کیا، الزامات اور شبہات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی، عوام الناس کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کیں، ناواقف لوگوں کو نبی ﷺ کی بات سننے سے روکنے کی کوششیں کیں، اسلام قبول کرنے والوں پر نہایت وحشیانہ ظلم وستم ڈھائے، ان کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کیا، اور ان کو اتنا تنگ کیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ دو دفعہ اپنے گھر چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبور ہوئے اور بالآخر تیسری مرتبہ ان سب کو مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ مکے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی نہ کسی فرد نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ بیشتر مخالفین اسلام کی دشمنی میں شدت اور تلخی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اپنے بھائی، بھتیجے، بیٹے، بیٹیاں، بہنیں اور بہنوئی دعوت اسلام کے نہ صرف پیرو بلکہ جاں نثار حامی ہو گئے تھے اور ان کے اپنے دل و

جگر کے ٹکڑے ہی ان سے برسرِ پیکار ہونے کو تیار تھے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو لوگ پرانی جاہلیت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نوخیز تحریک کی طرف آ رہے تھے وہ پہلے بھی اپنی سوسائٹی کے بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے بعد وہ اتنے نیک، اتنے راست باز اور اتنے پاکیزہ اخلاق کے انسان بن جاتے تھے کہ دنیا اس دعوت کی برتری محسوس کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی جو ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور انہیں یہ کچھ بنا رہی تھی۔

اس طویل اور شدید کشمکش کے دوران میں اللہ تعالیٰ حسبِ موقع اور حسبِ ضرورت اپنے نبی پر ایسے پرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو ان کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ اور فضیلت اخلاق اور پاکیزگی سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنت کی بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی گئی، انہیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جدّ و جہد کرنے پر ابھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والوں کو ان قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، ان تباہ شدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر سے شب و روز اپنے سفروں میں ان کا گزر ہوتا تھا، توحید اور آخرت کی دلیلیں ان کھلی کھلی نشانیوں سے دی گئیں جو رات دن زمین اور آسمان میں ان کی آنکھوں کے سامنے نمایاں تھیں اور جن کو وہ خود اپنی زندگی میں بھی ہر وقت دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، شرک اور دعوائے خودمختاری اور انکارِ آخرت اور تقلیدِ آبائی کی غلطیاں ایسے بیّن دلائل سے واضح کی گئیں جو دل کو لگنے اور دماغ میں اتر جانے والے تھے۔ پھر ان کے ایک ایک شبہ کو رفع کیا گیا، ایک ایک اعتراض کا معقول جواب دیا گیا، ایک ایک الجھن جس میں وہ خود پڑے ہوئے تھے یا دوسروں کو الجھانے کی کوشش کرتے تھے، صاف کی گئی، اور ہر طرف سے گھیر کر جاہلیت کو ایسا تنگ پکڑا گیا کہ عقل و خرد کی دنیا میں اس کے لیے ٹھیرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ پھر ان کو خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کا خوف دلایا گیا، ان کے برے اخلاق اور غلط طرزِ زندگی اور جاہلانہ رسوم اور حق دشمنی اور مومن آزاری پر انہیں ملامت کی گئی، اور اخلاق و تمدن کے وہ بڑے بڑے بنیادی اصول ان کے سامنے پیش کیے گئے جن پر ہمیشہ سے خدا کی پسندیدہ صالح تہذیبوں کی تعمیر ہوتی چلی آ رہی ہے۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جدوجہد اور مزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا، اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوع بڑھتا گیا۔ یہ ہے قرآن مجید کی مکی سورتوں کا پس منظر۔

مکے میں اس تحریک کو اپنا کام کرتے ہوئے تیرہ سال گزر چکے تھے کہ یکایک مدینے میں اس کو ایک ایسا مرکز بہم پہنچ

گیا جہاں اس کے لیے یہ ممکن ہوگیا کہ عرب کے تمام حصوں سے اپنے پیروؤں کو سمیٹ کر ایک جگہ اپنی طاقت مجتمع کر لے۔ چنانچہ نبی ﷺ اور بیشتر متبعین اسلام ہجرت کر کے مدینے پہنچ گئے۔ اس طرح یہ دعوت تیسرے مرحلے میں داخل ہوئی۔

اس مرحلے میں حالات کا نقشہ بالکل بدل گیا۔ امت مسلمہ ایک باقاعدہ ریاست کی بنا ڈالنے میں کامیاب ہوگئی۔ پرانی جاہلیت کے علم برداروں سے مسلح مقابلہ شروع ہوا۔ پچھلے انبیاء کی امتوں (یہود و نصاریٰ) سے بھی سابقہ پیش آیا۔ خود امت مسلمہ کے اندرونی نظام میں مختلف قسم کے منافق گھس آئے اور ان سے بھی نمٹنا پڑا۔ اور دس سال کی شدید کشمکش سے گزر کر آخر کار یہ تحریک کامیابی کی اس منزل پر پہنچی کہ سارا عرب اس کے زیر نگیں ہوگیا اور عالمگیر دعوت و اصلاح کے دروازے اس کے سامنے کھل گئے۔ اس مرحلے کی بھی مختلف منزلیں تھیں اور ہر منزل میں اس تحریک کی مخصوص ضرورتیں تھیں۔ ان ضرورتوں کے مطابق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی تقریریں نبی ﷺ پر نازل ہوتی رہیں جن کا انداز کبھی آتشیں خطابت کا، کبھی شاہانہ فرامین و احکام کا، کبھی معلمانہ درس و تعلیم کا، اور کبھی مصلحانہ افہام و تفہیم کا ہوتا تھا۔ ان میں بتایا گیا کہ جماعت اور ریاست اور مدنیت صالحہ کی تعمیر کس طرح کی جائے، زندگی کے مختلف شعبوں کو کن اصول و ضوابط پر قائم کیا جائے، منافقین سے کیا سلوک ہو، ذمی کافروں سے کیا برتاؤ ہو، اہل کتاب سے تعلقات کی کیا نوعیت رہے، برسر جنگ دشمنوں اور معاہد قوموں کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کیا جائے، اور منظم اہل ایمان کا یہ گروہ دنیا میں خداوند عالم کی خلافت کے فرائض انجام دینے کے لیے اپنے آپ کو کس طرح تیار کرے۔ ان تقریروں میں ایک طرف مسلمانوں کی تعلیم و تربیت کی جاتی تھی، ان کی کمزوریوں پر تنبیہ کی جاتی تھی، ان کو راہ خدا میں جان و مال سے جہاد کرنے پر ابھارا جاتا تھا، ان کو شکست اور فتح، مصیبت اور راحت، بدحالی اور خوش حالی، امن اور خوف، غرض ہر حال میں اس کے مناسب اخلاقیات کا درس دیا جاتا تھا، اور انہیں اس طرح تیار کیا جاتا تھا کہ وہ نبی ﷺ کے بعد آپ کے جانشین بن کر اس دعوت و اصلاح کے کام کو انجام دے سکیں۔ دوسری طرف ان لوگوں کو جو دائرۂ ایمان سے باہر تھے، اہل کتاب، منافقین، کفار و مشرکین، سب کو ان کی مختلف حالتوں کے لحاظ سے سمجھانے، نرمی سے دعوت دینے، سختی سے ملامت اور نصیحت کرنے، خدا کے عذاب سے ڈرانے اور سبق آموز واقعات و احوال سے عبرت دلانے کی کوشش کی جاتی تھی، تاکہ ان پر حجت تمام کر دی جائے۔ یہ ہے قرآن مجید کی مدنی سورتوں کا پس منظر۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن مجید ایک دعوت کے ساتھ اترنا شروع ہوا، اور وہ دعوت اپنے آغاز سے لے کر اپنی انتہائی تکمیل تک تئیس سال کی مدت میں جن جن مرحلوں اور جن جن منزلوں سے گزرتی رہی، ان کی مختلف النوع ضرورتوں کے مطابق قرآن کے مختلف حصے نازل ہوتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی کتاب میں وہ تصنیفی ترتیب نہیں ہو سکتی جو ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لیے کسی مقالے میں اختیار کی جاتی ہے۔ پھر اس دعوت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ قرآن کے جو چھوٹے اور بڑے حصے نازل ہوئے وہ بھی رسالوں کی شکل میں شائع نہیں کیے

جاتے تھے، بلکہ تقریروں کی شکل میں بیان کیے جاتے اور اسی شکل میں پھیلائے جاتے تھے، اس لیے ان کا اسلوب بھی تحریری نہ تھا بلکہ خطابت کا اسلوب تھا۔ پھر یہ خطابت بھی ایک پروفیسر کے لیکچروں کی سی نہیں بلکہ ایک داعی کے خطبوں کی سی تھی جسے دل اور دماغ، عقل اور جذبات، ہر ایک سے اپیل کرنا ہوتا ہے، جس کو ہر قسم کی ذہنیتوں سے سابقہ پیش آتا ہے، جسے اپنی دعوت وتبلیغ اور عملی تحریک کے سلسلے میں بے شمار مختلف حالتوں میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر ممکن پہلو سے اپنی بات دلوں میں بٹھانا، خیالات کی دنیا بدلنا، جذبات کا سیلاب اٹھانا، مخالفتوں کا زور توڑنا، ساتھیوں کی اصلاح و تربیت کرنا اور ان میں جوش اور عزم ابھارنا، دشمنوں کو دوست، اور منکروں کو معترف بنانا، مخالفین کی حجت منقطع کرنا اور ان کی اخلاقی طاقت کا استیصال کر دینا، غرض اسے وہ سب کچھ کرنا ہوتا ہے جو ایک دعوت کے علم بردار اور ایک تحریک کے رہنما کے لیے ضروری ہے۔ اس لیے اللہ نے اس کام کے سلسلے میں اپنے پیغمبر پر جو تقریریں نازل فرمائیں ان کا طرز خطابت وہی تھا جو ایک دعوت کے مناسب حال ہوتا ہے، ان میں کالج کے لیکچروں کا سا انداز تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے کہ قرآن میں مضامین کی اس قدر تکرار کیوں ہے۔ ایک دعوت اور عملی تحریک کا فطری اقتضا یہ ہے کہ وہ جس وقت جس مرحلے میں ہو اس میں وہی باتیں کہی جائیں جو اس مرحلے سے مناسبت رکھتی ہوں، اور جب تک دعوت ایک مرحلے میں رہے بعد کے مراحل کی بات نہ چھیڑی جائے بلکہ اسی مرحلے کی باتوں کا اعادہ کیا جاتا رہے، خواہ اس میں چند مہینے لگیں یا کئی سال صرف ہو جائیں۔ پھر اگر ایک ہی قسم کی باتوں کا اعادہ ایک ہی عبارت اور ایک ہی ڈھنگ پر کیا جاتا رہے تو کان انہیں سنتے سنتے تھک جاتے ہیں اور طبیعتیں اکتانے لگتی ہیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر مرحلے میں جو باتیں بار بار کہنی ہوں انہیں ہر بار نئے الفاظ، نئے اسلوب، اور نئی آن بان سے کہا جائے تاکہ نہایت خوش گوار طریقے سے وہ دلوں میں بیٹھ جائیں اور دعوت کی ایک ایک منزل اچھی طرح مستحکم ہوتی چلی جائے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ دعوت کی بنیاد جن عقائد اور اصولوں پر ہو انہیں پہلے قدم سے آخری منزل تک کسی وقت اور کسی حال میں نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا جائے بلکہ ان کا اعادہ بہر حال دعوت کے ہر مرحلے میں ہوتا رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت اسلامی کے ایک مرحلے میں قرآن کی جتنی سورتیں نازل ہوئی ہیں ان سب میں بالعموم ایک ہی قسم کے مضامین الفاظ اور انداز بیان بدل بدل کر آئے ہیں۔ مگر توحید اور صفات الٰہی، آخرت اور اس کی باز پرس اور جزا و سزا، رسالت اور ایمان بالکتاب، تقویٰ اور صبر و توکل اور اسی قسم کے دوسرے بنیادی مضامین کی تکرار پورے قرآن میں نظر آتی ہے کیونکہ اس تحریک کے کسی مرحلے میں بھی ان سے غفلت گوارا نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ بنیادی تصورات اگر ذرا بھی کمزور ہو جاتے تو اسلام کی یہ تحریک اپنی صحیح روح کے ساتھ نہ چل سکتی۔

اگر غور کیا جائے تو اسی بیان سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے کہ نبی ﷺ نے قرآن کو اسی ترتیب کے ساتھ کیوں نہ مرتب کر دیا جس کے ساتھ وہ نازل ہوا تھا۔

اوپر آپ کو معلوم ہو چکا ہے کہ تئیس سال تک قرآن کا نزول اس ترتیب سے ہوتا رہا جس ترتیب سے دعوت کا

آغاز اور اس کا ارتقا ہوا۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دعوت کی تکمیل کے بعد ان نازل شدہ اجزاء کے لیے وہ ترتیب کسی طرح درست نہ ہوسکتی تھی جو صرف ارتقاء دعوت ہی کے ساتھ مناسبت رکھتی تھی۔ اب تو ان کے لیے ایک دوسری ہی ترتیب درکار تھی جو تکمیل دعوت کے بعد کی صورت حال کے لیے زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ ابتدا میں اس کے مخاطب اوّل وہ لوگ تھے جو اسلام سے ناآشنائے محض تھے، اس لیے اس وقت بالکل نقطۂ آغاز سے تعلیم و تلقین شروع کی گئی۔ مگر تکمیل دعوت کے بعد اس کے مخاطب اوّل وہ لوگ ہوگئے جو اس پر ایمان لاکر ایک امت بن چکے تھے اور اس کام کو جاری رکھنے کے ذمہ دار قرار پائے تھے جسے پیغمبر نے نظریے اور عمل، دونوں حیثیتوں سے مکمل کر کے ان کے حوالے کیا تھا۔ اب لامحالہ مقدم چیز یہ ہوگئی کہ پہلے یہ لوگ خود اپنے فرائض سے، اپنے قوانین حیات سے، اور ان فتنوں سے جو پچھلے پیغمبروں کی امتوں میں رونما ہوتے رہے ہیں، اچھی طرح واقف ہولیں، پھر اسلام سے بیگانہ دنیا کے سامنے خدا کی ہدایت پیش کرنے کے لیے آگے بڑھیں۔

علاوہ بریں قرآن مجید جس طرز کی کتاب ہے اسے اگر آدمی اچھی طرح سمجھ لے تو اس پر خود ہی یہ حقیقت منکشف ہوجائے گی کہ ایک ایک طرح کے مضامین کو ایک ایک جگہ جمع کرنا اس کتاب کے مزاج ہی سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اس کے مزاج کا تو تقاضا یہی ہے کہ اس کے پڑھنے والے کے سامنے مدنی مرحلے کی باتیں مکی دور والی تعلیم کے درمیان، اور مکی مرحلے کی باتیں مدنی دور والی تقریروں کے درمیان، اور ابتدا کی گفتگوئیں آخر کی تلقینات کے بیچ میں، اور آخری دور کی ہدایات آغاز کار کی تعلیمات کے پہلو میں بار بار آتی چلی جائیں، تاکہ اسلام کا پورا منظر اور جامع نقشہ اس کی نگاہ میں رہے اور کسی وقت بھی وہ یک رخا نہ ہونے پائے۔

پھر اگر قرآن کو اس کی نزولی ترتیب پر مرتب کیا بھی جاتا تو وہ ترتیب بعد کے لوگوں کے لیے صرف اسی صورت میں بامعنی ہوسکتی تھی جب کہ قرآن کے ساتھ اس کی پوری تاریخ نزول اور اس کے ایک ایک جزء کی کیفیت نزول و شان نزول لکھ کر لگا دی جاتی اور وہ لازمی طور پر قرآن کا ایک ضمیمہ بن کر رہتی۔ یہ بات اس مقصد کے خلاف تھی جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کا یہ مجموعہ مرتب اور محفوظ کرایا تھا۔ وہاں تو پیش نظر چیز ہی یہ تھی کہ خالص کلام الٰہی بغیر کسی دوسرے کلام کی آمیزش یا شمول کے، اپنی مختصر صورت میں مرتب ہو، جسے بچے، جوان، بوڑھے، عورت، مرد، شہری، دیہاتی، عامی، عالم، سب پڑھیں، ہر زمانے میں اور ہر جگہ ہر حالت میں پڑھیں، اور ہر مرتبۂ عقل و دانش کا انسان کم از کم یہ بات ضرور جان لے کہ اس کا خدا اس سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ یہ مقصد فوت ہوجاتا اگر اس مجموعۂ کلام الٰہی کے ساتھ ایک لمبی چوڑی تاریخ بھی لگی ہوئی ہوتی اور اس کی تلاوت بھی لازم کردی جاتی۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی موجودہ ترتیب پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں، وہ اس کتاب کے مقصد و مدّعا سے صرف نابلد ہی نہیں ہیں، بلکہ کچھ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا معلوم ہوتے ہیں کہ یہ کتاب محض علم تاریخ اور فلسفۂ عمران کے طلبہ ہی کے لیے نازل ہوئی ہے۔

ترتیب قرآن کے سلسلے میں یہ بات بھی ناظرین کو معلوم ہوجانی چاہیے کہ یہ ترتیب بعد کے لوگوں کی دی

ہوئی نہیں ہے، بلکہ خود اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت نبی ﷺ ہی نے قرآن کو اس طرح مرتب فرمایا تھا۔ قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی سورۃ نازل ہوتی تو آپ اسی وقت اپنے کاتبوں میں سے کسی کو بلاتے اور اس کو ٹھیک ٹھیک قلمبند کرانے کے بعد ہدایت فرما دیتے کہ یہ سورۃ فلاں سورہ کے بعد اور فلاں سورہ سے پہلے رکھی جائے۔ اسی طرح اگر قرآن کا کوئی ایسا حصہ نازل ہوتا جس کو مستقل سورۃ بنانا پیش نظر نہ ہوتا، تو آپ ہدایت فرما دیتے تھے کہ اسے فلاں سورہ میں فلاں مقام پر درج کیا جائے۔ پھر اسی ترتیب سے آپ خود بھی نماز میں اور دوسرے مواقع پر قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے اور اسی ترتیب کے مطابق صحابۂ کرام بھی اس کو یاد کرتے تھے۔ لہٰذا یہ ایک ثابت شدہ تاریخی حقیقت ہے کہ قرآن مجید کا نزول جس روز مکمل ہوا اسی روز اس کی ترتیب بھی مکمل ہوگئی۔ جو اس کا نازل کرنے والا تھا وہی اس کا مرتب کرنے والا بھی تھا۔ جس کے قلب پر وہ نازل کیا گیا اسی کے ہاتھوں اسے مرتب بھی کرا دیا گیا۔ کسی دوسرے کی مجال نہ تھی کہ اس میں مداخلت کرتا۔

چونکہ نماز ابتدا ہی سے مسلمانوں پر فرض[1] تھی، اور تلاوت قرآن کو نماز کا ایک ضروری جزء قرار دیا گیا تھا، اس لیے نزول قرآن کے ساتھ ہی مسلمانوں میں حفظ قرآن کا سلسلہ جاری ہو گیا اور جیسے جیسے قرآن اترتا گیا مسلمان اس کو یاد بھی کرتے چلے گئے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت کا انحصار صرف کھجور کے ان پتوں اور ہڈی اور جھلی کے ان ٹکڑوں ہی پر نہ تھا جن پر نبی ﷺ اپنے کاتبوں سے اس کو قلمبند کرایا کرتے تھے، بلکہ وہ اترتے ہی بیسیوں، پھر سینکڑوں، پھر ہزاروں، پھر لاکھوں دلوں پر نقش ہو جاتا تھا اور کسی شیطان کے لیے اس کا امکان ہی نہ تھا کہ اس میں ایک لفظ کا بھی ردوبدل کر سکے۔

نبی ﷺ کی وفات کے بعد جب عرب میں ارتداد کا طوفان اٹھا اور اس کے فرو کرنے کے لیے صحابۂ کرام کو سخت خوں ریز لڑائیاں لڑنی پڑیں، تو ان معرکوں میں ایسے صحابہ کی ایک کثیر تعداد شہید ہوگئی جن کو پورا قرآن حفظ تھا۔ اس سے حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہوا کہ قرآن کی حفاظت کے معاملے میں صرف ایک ہی ذریعے پر اعتماد کر لینا مناسب نہیں ہے، بلکہ الواح قلب کے ساتھ ساتھ صفحات قرطاس پر بھی اس کو محفوظ کرنے کا انتظام کر لینا چاہیے۔ چنانچہ اس کام کی ضرورت انہوں نے حضرت ابوبکرؓ پر واضح کی اور انہوں نے کچھ تامل کے بعد اس سے اتفاق کر کے حضرت زید بن ثابت انصاریؓ کو، جو نبی ﷺ کے کاتب (سکریٹری) رہ چکے تھے اس خدمت پر مامور فرمایا۔ قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ ایک طرف تو وہ تمام لکھے ہوئے اجزاء فراہم کر لیے جائیں جو نبی ﷺ نے چھوڑے ہیں، دوسری طرف صحابۂ کرام میں سے بھی جس جس کے پاس قرآن یا اس کا کوئی حصہ لکھا ہوا ملے، وہ ان سے لے لیا جائے،[2] اور پھر حفاظ قرآن سے بھی مدد لی جائے، اور ان تینوں ذرائع کی متفقہ شہادت پر، کامل صحت کا اطمینان کرنے کے بعد، قرآن کا ایک ایک لفظ مصحف میں ثبت کیا جائے۔

---

(۱) واضح رہے کہ پنج وقتہ نماز تو بعثت کے کئی سال بعد فرض ہوئی، لیکن نماز بجائے خود اوّل روز ہی سے فرض تھی۔ اسلام کی کوئی ساعت کبھی ایسی نہیں گزری ہے جس میں نماز فرض نہ ہو۔

(۲) معتبر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضورؐ کی زندگی میں متعدد صحابہ نے قرآن کو یا اس کے مختلف اجزاء کو اپنے پاس قلمبند کر کے رکھ چھوڑا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں حضرات عثمان، علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن عاص، سالم مولیٰ حذیفہ، زید بن ثابت، معاذ بن جبل، ابی بن کعب، اور ابوزید قیس بن السکن رضی اللہ عنہم کے ناموں کی تصریح ملتی ہے۔

اس تجویز کے مطابق قرآن مجید کا ایک مستند نسخہ تیار کر کے امّ المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رکھوا دیا گیا اور لوگوں کو عام اجازت دے دی گئی کہ جو چاہے اس کی نقل کرے اور جو چاہے اس سے مقابلہ کر کے اپنے نسخے کی تصحیح کر لے۔

عرب میں مختلف علاقوں اور قبیلوں کی بولیوں میں ویسے ہی فرق پائے جاتے تھے جیسے ہمارے ملک میں شہر شہر کی بولی اور ضلع ضلع کی بولی میں فرق ہے، حالانکہ زبان سب کی وہی ایک اردو یا پنجابی یا بنگالی وغیرہ ہے۔ قرآن مجید اگرچہ نازل اس زبان میں ہوا تھا جو مکہ میں قریش کے لوگ بولتے تھے، لیکن ابتداءً اس امر کی اجازت دے دی گئی تھی کہ دوسرے علاقوں اور قبیلوں کے لوگ اپنے اپنے لہجے اور محاورے کے مطابق اسے پڑھ لیا کریں، کیونکہ اس طرح معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، صرف عبارت ان کے لیے ملائم ہو جاتی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ جب اسلام پھیلا اور عرب کے لوگوں نے اپنے ریگستان سے نکل کر دنیا کے ایک بڑے حصے کو فتح کر لیا، اور دوسری قوموں کے لوگ بھی دائرۂ اسلام میں آنے لگے، اور بڑے پیمانے پر عرب و عجم کے اختلاط سے عربی زبان متاثر ہونے لگی، تو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر اب بھی دوسرے لہجوں اور محاوروں کے مطابق قرآن پڑھنے کی اجازت باقی رہی تو اس سے طرح طرح کے فتنے کھڑے ہو جائیں گے۔ مثلاً یہ کہ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو غیر مانوس طریقے پر کلام اللہ کی تلاوت کرتے ہوئے سنے گا اور یہ سمجھ کر اس سے لڑ پڑے گا کہ وہ دانستہ کلام الٰہی میں تحریف کر رہا ہے۔ یا یہ کہ یہ لفظی اختلافات رفتہ رفتہ واقعی تحریفات کا دروازہ کھول دیں گے۔ یا یہ کہ عرب و عجم کے اختلاط سے جن لوگوں کی زبان بگڑے گی وہ اپنی بگڑی ہوئی زبان کے مطابق قرآن میں تصرف کر کے اس کے حسن کلام کو بگاڑ دیں گے۔ ان وجوہ سے حضرت عثمانؓ نے صحابۂ کرام کے مشورے سے یہ طے کیا کہ تمام ممالک اسلامیہ میں صرف اس معیاری نسخۂ قرآن کی نقلیں شائع کی جائیں جو حضرت ابوبکرؓ کے حکم سے ضبط تحریر میں لایا گیا تھا، اور باقی تمام دوسرے لہجوں اور محاوروں پر لکھے ہوئے مصاحف کی اشاعت ممنوع قرار دے دی جائے۔

آج جو قرآن ہمارے ہاتھوں میں ہے، یہ ٹھیک ٹھیک اسی مصحف صدیقی کے مطابق ہے جس کی نقلیں حضرت عثمانؓ نے سرکاری اہتمام سے تمام دیار و امصار میں بھجوائی تھیں۔ اس وقت بھی دنیا میں متعدد مقامات پر قرآن کے وہ مستند نسخے موجود ہیں۔ کسی کو اگر قرآن کی محفوظیت میں ذرہ برابر بھی شک ہو تو وہ اپنا اطمینان اس طرح کر سکتا ہے کہ مغربی افریقہ میں کسی کتاب فروش سے قرآن کا ایک نسخہ خریدے، اور جاوا میں کسی حافظ سے زبانی قرآن سن کر اس کا مقابلہ کرے، اور پھر دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں میں حضرت عثمانؓ کے وقت سے لے کر آج تک مختلف صدیوں کے لکھے ہوئے جو مصاحف رکھے ہیں ان سے اس کا تقابل کر لے۔ اگر کسی حرف یا شوشے کا فرق وہ پائے تو اس کا فرض ہے کہ دنیا کو اس سب سے بڑے تاریخی انکشاف سے ضرور مطلع کرے۔ کوئی شک نواز قرآن کے منزل من اللہ ہونے میں شک کرنا چاہے تو کر سکتا ہے، لیکن یہ بات کہ جو قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے یہ بلا کسی کمی بیشی کے ٹھیک وہی قرآن

ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، یہ تو ایک ایسی تاریخی حقیقت ہے جس میں کسی شک کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ انسانی تاریخ میں کوئی دوسری چیز ایسی نہیں پائی جاتی جو اس قدر قطعی الثبوت ہو۔ اگر کوئی شخص اس کی صحت میں شک کرتا ہے تو وہ پھر اس میں بھی شک کر سکتا ہے کہ رومن امپائر نامی کوئی سلطنت دنیا میں رہ چکی ہے، اور کبھی مغل ہندستان پر حکومت کر چکے ہیں، اور ''نپولین'' نام کا کوئی شخص بھی دنیا میں پایا گیا ہے۔ ایسے ایسے تاریخی حقائق پر شکوک کا اظہار کرنا علم کا نہیں، جہالت کا ثبوت ہے۔

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس کی طرف دنیا میں بے شمار انسان بے شمار مقاصد لے کر رجوع کرتے ہیں۔ ان سب کی ضروریات اور اغراض کو پیش نظر رکھ کر کوئی مشورہ دینا آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے۔ طالبوں کے اس ہجوم میں مجھ کو صرف ان لوگوں سے دلچسپی ہے جو اس کو سمجھنا چاہتے ہیں اور یہ معلوم کرنے کے خواہش مند ہیں کہ یہ کتاب انسان کے مسائل زندگی میں اس کی کیا رہنمائی کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کو میں یہاں طریق مطالعۂ قرآن کے بارے میں کچھ مشورے دوں گا اور کچھ ان مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کروں گا جو بالعموم انسان کو اس معاملے میں پیش آتی ہیں۔

کوئی شخص چاہے قرآن پر ایمان رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، بہر حال اگر وہ اس کتاب کو فی الواقع سمجھنا چاہتا ہے تو اوّلین کام اسے یہ کرنا چاہیے کہ اپنے ذہن کو پہلے سے قائم کیے ہوئے تصورات اور نظریات سے، اور موافقانہ یا مخالفانہ اغراض سے جس حد تک ممکن ہو خالی کر لے اور سمجھنے کا خالص مقصد لے کر کھلے دل سے اس کو پڑھنا شروع کرے۔ جو لوگ چند مخصوص قسم کے خیالات ذہن میں لے کر اس کتاب کو پڑھتے ہیں وہ اس کی سطروں کے درمیان اپنے ہی خیالات پڑھتے چلے جاتے ہیں، قرآن کی ان کو ہوا بھی نہیں لگنے پاتی۔ یہ طریق مطالعہ کسی کتاب کو پڑھنے کے لیے بھی صحیح نہیں ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ قرآن تو اس طرز کے پڑھنے والوں کے لیے اپنے معانی کے دروازے کھولتا ہی نہیں۔

پھر جو شخص محض سرسری سی واقفیت بہم پہنچانا چاہتا ہو، اس کے لیے تو شاید ایک دفعہ پڑھ لینا کافی ہو جائے لیکن جو اس کی گہرائیوں میں اترنا چاہے اس کے لیے دو چار دفعہ کا پڑھنا بھی کافی نہیں ہو سکتا۔ اس کو بار بار پڑھنا چاہیے، ہر مرتبہ ایک خاص ڈھنگ سے پڑھنا چاہیے، اور ایک طالب علم کی طرح پنسل اور کاپی ساتھ لے کر بیٹھنا چاہیے تاکہ ضروری نکات نوٹ کرتا جائے۔ اس طرح جو لوگ پڑھنے پر آمادہ ہوں ان کو کم از کم دو مرتبہ پورے قرآن کو صرف اس غرض کے لیے پڑھنا چاہیے کہ ان کے سامنے بحیثیت مجموعی وہ پورا نظام فکر و عمل آ جائے جسے یہ کتاب پیش کرنا چاہتی ہے۔ اس ابتدائی مطالعہ کے دوران میں وہ قرآن کے پورے منظر پر ایک جامع نظر حاصل کرنے کی کوشش کریں اور یہ دیکھتے جائیں کہ یہ کتاب کیا بنیادی تصورات پیش کرتی ہے اور پھر ان تصورات پر کس قسم کا نظام زندگی تعمیر کرتی ہے۔ اس اثنا میں اگر کسی مقام پر کوئی سوال ذہن میں کھٹکے تو اس پر وہیں اسی وقت کوئی فیصلہ نہ کر بیٹھیں بلکہ اسے

نوٹ کرلیں اور صبر کے ساتھ آگے مطالعہ جاری رکھیں۔ اغلب یہ ہے کہ آگے کہیں نہ کہیں انہیں اس کا جواب مل جائے گا۔ اگر جواب مل جائے تو اپنے سوال کے ساتھ اسے نوٹ کرلیں۔ لیکن اگر پہلے مطالعہ کے دوران میں انہیں اپنے کسی سوال کا جواب نہ ملے تو صبر کے ساتھ دوسری بار پڑھیں۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ دوسری بار کے غائر مطالعہ میں شاذ و نادر ہی کوئی سوال جواب طلب باقی رہ جاتا ہے۔

اس طرح قرآن پر ایک جامع نظر حاصل کر لینے کے بعد تفصیلی مطالعہ کی ابتدا کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں ناظر کو تعلیمات قرآن کا ایک ایک پہلو ذہن نشین کر کے نوٹ کرتے جانا چاہیے۔ مثلاً وہ اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ انسانیت کا کون سا نمونہ ہے جسے قرآن پسندیدہ قرار دیتا ہے اور کس نمونے کے انسان اس کے نزدیک مبغوض و مردود ہیں۔ اس مضمون کو اچھی طرح اپنی گرفت میں لانے کے لیے اس کو چاہیے کہ اپنی کاپی پر ایک طرف ''پسندیدہ انسان'' اور دوسری طرف ''ناپسندیدہ انسان'' کی خصوصیات آمنے سامنے نوٹ کرتا چلا جائے۔ یا مثلاً وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ قرآن کے نزدیک انسان کی فلاح و نجات کا مدار کن امور پر ہے، اور کیا چیزیں ہیں جن کو وہ انسان کے لیے نقصان اور ہلاکت اور بربادی کا موجب قرار دیتا ہے۔ اس مضمون کو بھی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ جاننے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنی کاپی پر ''موجبات فلاح'' اور ''موجبات خسران'' کے دو عنوانات ایک دوسرے کے مقابل قائم کرلے اور مطالعۂ قرآن کے دوران میں روزانہ دونوں قسم کی چیزوں کو نوٹ کرتا جائے۔ علی ہذا القیاس عقائد، اخلاق، حقوق، فرائض، معاشرت، تمدن، معیشت، سیاست، قانون، نظم جماعت، صلح، جنگ، اور دوسرے مسائل زندگی میں سے ایک ایک کے متعلق قرآن کی ہدایات کو آدمی نوٹ کرتا چلا جائے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ ان میں سے ہر ہر شعبے کی مجموعی شکل کیا بنتی ہے اور پھر ان سب کو ملا کر جوڑ دینے سے پورا نقشۂ زندگی کس قسم کا بنتا ہے۔

پھر جب آدمی کسی خاص مسئلۂ زندگی کے بارے میں تحقیق کرنا چاہے کہ قرآن کا نقطۂ نظر اس کے متعلق کیا ہے، تو اس کے لیے عمدہ طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اس مسئلے کے متعلق قدیم و جدید لٹریچر کا گہرا مطالعہ کر کے واضح طور پر یہ معلوم کرلے کہ اس مسئلے کے بنیادی نکات کیا ہیں، انسان نے اب تک اس پر کیا سوچا اور سمجھا ہے، کیا امور اس میں تصفیہ طلب ہیں، اور کہاں جا کر انسانی فکر کی گاڑی اٹک جاتی ہے۔ اس کے بعد انہی تصفیہ طلب مسائل کو نگاہ میں رکھ کر آدمی کو قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ میرا تجربہ ہے کہ اس طرح جب آدمی کسی مسئلے کی تحقیق کے لیے قرآن پڑھنے بیٹھتا ہے تو اسے ایسی ایسی آیتوں میں اپنے سوالات کا جواب ملتا ہے جنہیں وہ اس سے پہلے بیسیوں مرتبہ پڑھ چکا ہوتا ہے اور کبھی اس کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ یہاں یہ مضمون بھی چھپا ہوا ہے۔

لیکن فہم قرآن کی ان ساری تدبیروں کے باوجود آدمی قرآن کی روح سے پوری طرح آشنا نہیں ہونے پاتا

جب تک کہ عملاً وہ کام نہ کرے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہ محض نظریات اور خیالات کی کتاب نہیں ہے کہ آپ آرام کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھیں اور اس کی ساری باتیں سمجھ جائیں۔ یہ دنیا کے عام تصور مذہب کے مطابق ایک نری مذہبی کتاب بھی نہیں ہے کہ مدرسے اور خانقاہ میں اس کے سارے رموز حل کر لیے جائیں۔ جیسا کہ اس مقدمے کے آغاز میں بتایا جا چکا ہے، یہ ایک دعوت اور تحریک کی کتاب ہے۔ اس نے آتے ہی ایک خاموش طبع اور نیک نہاد انسان کو گوشۂ عزلت سے نکال کر خدا سے پھری ہوئی دنیا کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ باطل کے خلاف اس سے آواز اٹھوائی اور وقت کے علم برداران کفر و فسق و ضلالت سے اس کو لڑا دیا۔ گھر گھر سے ایک ایک سعید روح اور پاکیزہ نفس کو کھینچ کھینچ کر لائی اور داعی حق کے جھنڈے تلے ان سب کو اکٹھا کیا۔ گوشے گوشے سے ایک ایک فتنہ جو اور فساد پرور کو بھڑکا کر اٹھایا اور حامیان حق سے ان کی جنگ کرائی۔ ایک فرد واحد کی پکار سے اپنا کام شروع کر کے خلافت الٰہیہ کے قیام تک پورے تیئیس سال یہی کتاب اس عظیم الشان تحریک کی رہنمائی کرتی رہی، اور حق و باطل کی اس طویل و جاں گسل کشمکش کے دوران میں ایک ایک منزل اور ایک ایک مرحلے پر اسی نے تخریب کے ڈھنگ اور تعمیر کے نقشے بتائے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ سرے سے نزاع کفر و دین اور معرکۂ اسلام و جاہلیت کے میدان میں قدم ہی نہ رکھیں اور اس کشمکش کی کسی منزل سے گزرنے کا آپ کو اتفاق ہی نہ ہوا ہو اور پھر محض قرآن کے الفاظ پڑھ پڑھ کر اس کی ساری حقیقتیں آپ کے سامنے بے نقاب ہو جائیں۔ اسے تو پوری طرح آپ اسی وقت سمجھ سکتے ہیں جب اسے لے کر اٹھیں اور دعوت الی اللہ کا کام شروع کریں اور جس جس طرح یہ کتاب ہدایت دیتی جائے اس طرح قدم اٹھاتے چلے جائیں۔ تب وہ سارے تجربات آپ کو پیش آئیں گے جو نزول قرآن کے وقت پیش آئے تھے۔ مکے اور حبش اور طائف کی منزلیں بھی آپ دیکھیں گے اور بدر و اُحد سے لے کر حنین اور تبوک تک کے مراحل بھی آپ کے سامنے آئیں گے۔ ابوجہل اور ابولہب سے بھی آپ کو واسطہ پڑے گا، منافقین اور یہود بھی آپ کو ملیں گے، اور سابقین اوّلین سے لے کر مؤلفۃ القلوب تک سبھی طرح کے انسانی نمونے آپ دیکھ بھی لیں گے اور برت بھی لیں گے۔ یہ ایک اور ہی قسم کا ''سلوک'' ہے، جس کو میں ''سلوک قرآنی'' کہتا ہوں۔ اس سلوک کی شان یہ ہے کہ اس کی جس جس منزل سے آپ گزرتے جائیں گے، قرآن کی کچھ آیتیں اور سورتیں خود سامنے آ کر آپ کو بتاتی چلی جائیں گی کہ وہ اسی منزل میں اتری تھیں اور یہ ہدایت لے کر آئی تھیں۔ اس وقت یہ تو ممکن ہے کہ لغت اور نحو اور معانی اور بیان کے کچھ نکات سالک کی نگاہ سے چھپے رہ جائیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ قرآن اپنی روح کو اس کے سامنے بے نقاب کرنے سے بخل برت جائے۔

پھر اسی کلیہ کے مطابق قرآن کے احکام، اس کی اخلاقی تعلیمات، اس کی معاشی اور تمدنی ہدایات، اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اس کے بتائے ہوئے اصول و قوانین آدمی کی سمجھ میں اس وقت تک آ ہی نہیں سکتے جب تک

کہ وہ عملاً ان کو برت کر نہ دیکھے۔ نہ وہ فرد اس کتاب کو سمجھ سکتا ہے جس نے اپنی انفرادی زندگی کو اس کی پیروی سے آزاد کر رکھا ہو اور نہ وہ قوم اس سے آشنا ہو سکتی ہے جس کے سارے ہی اجتماعی ادارے اس کی بنائی ہوئی روش کے خلاف چل رہے ہوں۔

قرآن کے اس دعوے سے ہر کہ ومہ واقف ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کی ہدایت کے لیے آیا ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اس کو پڑھنے بیٹھتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کا روئے سخن زیادہ تر اپنے زمانۂ نزول کے اہل عرب کی طرف ہے۔ اگرچہ کبھی کبھی وہ بنی آدم اور عامۃ الناس کو بھی پکارتا ہے، لیکن اکثر باتیں وہ ایسی کہتا ہے جو عرب کے مذاق، عرب ہی کے ماحول، عرب ہی کی تاریخ، اور عرب ہی کے رسم و رواج سے ربط و تعلق رکھتی ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر آدمی سوچنے لگتا ہے کہ جو چیز عام انسانوں کی ہدایت کے لیے اتاری گئی تھی اس میں وقتی اور مقامی اور قومی عنصر اتنا زیادہ کیوں ہے؟ اس معاملے کی حقیقت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض لوگ اس شک میں پڑ جاتے ہیں کہ شاید یہ چیز اصل میں تو اپنے ہم عصر اہل عرب ہی کی اصلاح کے لیے تھی، لیکن بعد میں زبردستی کھینچ تان کر اسے تمام انسانوں کے لیے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کتاب ہدایت قرار دے دیا گیا۔

جو شخص یہ اعتراض محض اعتراض کی خاطر نہیں اٹھاتا، بلکہ فی الواقع اسے سمجھنا چاہتا ہے اسے میں مشورہ دوں گا کہ وہ پہلے خود قرآن کو پڑھ کر ذرا ان مقامات پر نشان لگائے جہاں اس نے کوئی ایسا عقیدہ، یا خیال، یا تصور پیش کیا ہو، یا کوئی ایسا اخلاقی اصول، یا عملی قاعدہ وضابطہ بیان کیا ہو جو صرف عرب ہی کے لیے مخصوص ہو، اور جس کو وقت اور زمانے اور مقام نے فی الواقع محدود کر رکھا ہو۔ محض یہ بات کہ وہ ایک خاص مقام اور زمانے کے لوگوں کو خطاب کر کے ان کے مشرکانہ عقائد اور رسوم کی تردید کرتا ہے، اور انہی کے گردوپیش کی چیزوں کو مواد استدلال کے طور پر لے کر توحید کے دلائل قائم کرتا ہے، یہ فیصلہ کر دینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ اس کی دعوت اور اس کا اپیل بھی وقتی اور مقامی ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ شرک کی تردید میں جو کچھ وہ کہتا ہے کیا وہ دنیا کے ہر شرک پر اسی طرح چسپاں نہیں ہوتا جس طرح مشرکین عرب کے شرک پر چسپاں ہوتا تھا؟ کیا انہی دلائل کو ہم ہر زمانے اور ہر ملک کے مشرکین کی اصلاح خیال کے لیے استعمال نہیں کر سکتے؟ اور کیا اثبات توحید کے لیے قرآن کے طرز استدلال کو تھوڑے سے ردوبدل کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ کام میں نہیں لایا جا سکتا؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ایک عالمگیر تعلیم کو صرف اس بنا پر وقتی و مقامی قرار دیا جائے کہ ایک خاص وقت میں ایک خاص قوم کو خطاب کر کے وہ پیش کی گئی تھی۔ دنیا کا کوئی فلسفہ اور کوئی نظام زندگی اور کوئی مذہب فکر ایسا نہیں ہے جس کی ساری باتیں از اوّل تا آخر تجریدی (Abstract) طرز بیان میں پیش کی گئی ہوں اور کسی متعین حالت یا صورت پر اس کو چسپاں کر کے ان کی توضیح نہ کی گئی ہو۔ ایسی مکمل تجرید اوّل تو ممکن نہیں ہے، اور ممکن ہو بھی تو جو چیز اس طریقے پر پیش کی جائے گی وہ صرف صفحۂ کاغذ ہی پر رہ جائے گی، انسانوں کی

زندگی میں اس کا جذب ہو کر ایک عملی نظام میں تبدیل ہونا محال ہے۔

پھر کسی فکری و اخلاقی اور تمدنی تحریک کو اگر بین الاقوامی پیمانے پر پھیلانا مقصود ہو، تو اس کے لیے بھی یہ قطعاً ضروری نہیں ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ مفید بھی نہیں ہے کہ شروع سے اس کو بالکل ہی بین الاقوامی بنانے کی کوشش کی جائے۔ درحقیقت اس کا صحیح عملی طریقہ صرف ایک ہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ جن افکار اور نظریات اور اصولوں پر وہ تحریک انسانی زندگی کے نظام کو قائم کرنا چاہتی ہے، انہیں پوری قوت کے ساتھ خود اس ملک میں پیش کیا جائے جہاں سے اس کی دعوت اٹھی ہو، ان لوگوں کے ذہن نشین کیا جائے جن کی زبان اور مزاج اور عادات و خصائل سے اس تحریک کے داعی بخوبی واقف ہوں، اور پھر اپنے ہی ملک میں ان اصولوں کو عملاً برت کر اور ان پر ایک کامیاب نظام زندگی چلا کر دنیا کے سامنے نمونہ پیش کیا جائے۔ تبھی دوسری قومیں اس کی طرف توجہ کریں گی اور ان کے ذہین آدمی خود آگے بڑھ کر اسے سمجھنے اور اپنے ملک میں رواج دینے کی کوشش کریں گے۔ لہٰذا محض یہ بات کہ کسی نظام فکر و عمل کو ابتداءً ایک ہی قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا، اور استدلال کا سارا زور اسی کو سمجھانے اور مطمئن کرنے پر صرف کر دیا گیا تھا، اس امر کی دلیل نہیں ہے کہ وہ نظام فکر و عمل محض قومی ہے۔ فی الواقع جو خصوصیات ایک قومی نظام کو ایک بین الاقوامی نظام سے اور ایک وقتی نظام کو ایک ابدی نظام سے ممیّز کرتی ہیں وہ یہ ہیں کہ قومی نظام یا تو ایک قوم کی برتری اور اس کے مخصوص حقوق کا مدعی ہوتا ہے، یا اپنے اندر کچھ ایسے اصول اور نظریات رکھتا ہے جو دوسری اقوام میں نہیں چل سکتے۔ اس کے برعکس جو نظام بین الاقوامی ہوتا ہے وہ تمام انسانوں کو برابر کا درجہ اور برابر کے حقوق دینے کے لیے تیار ہوتا ہے اور اس کے اصولوں میں بھی عالمگیریت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک وقتی نظام لازمی طور پر اپنی بنیاد کچھ ایسے اصولوں پر رکھتا ہے جو زمانے کی چند پلٹیوں کے بعد صریحاً ناقابل عمل ہو جاتے ہیں، اور اس کے برعکس ایک ابدی نظام کے اصول تمام بدلتے ہوئے حالات پر منطبق ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ان خصوصیات کو نگاہ میں رکھ کر کوئی شخص خود قرآن کو پڑھے اور ان چیزوں کو ذرا متعین کرنے کی کوشش کرے جن کی بنا پر واقعی یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ قرآن کا پیش کردہ نظام وقتی اور قومی ہے۔

قرآن کے متعلق یہ بات بھی ایک عام ناظر کے کان میں پڑی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ ایک مفصل ہدایت نامہ اور ایک کتاب آئین ہے۔ مگر جب وہ اسے پڑھتا ہے تو اس میں معاشرت اور تمدن اور سیاست اور معیشت وغیرہ کے تفصیلی احکام و ضوابط اس کو نہیں ملتے۔ بلکہ وہ دیکھتا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ جیسے فرائض کے متعلق بھی، جن پر قرآن بار بار اس قدر زور دیتا ہے، اس نے کوئی ایسا ضابطہ تجویز نہیں کیا ہے جس میں تمام ضروری احکام کی تفصیل درج ہو۔ یہ چیز بھی آدمی کے ذہن میں خلجان پیدا کرتی ہے کہ آخر یہ کس معنی میں ہدایت نامہ ہے۔

اس معاملے میں ساری الجھن صرف اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ آدمی کی نگاہ سے حقیقت کا ایک پہلو بالکل

اوجھل رہ جاتا ہے، یعنی یہ کہ خدا نے صرف کتاب ہی نازل نہیں کی تھی بلکہ ایک پیغمبر بھی مبعوث فرمایا تھا۔ اگر اصل اسکیم یہ ہو کہ بس ایک نقشۂ تعمیر لوگوں کو دے دیا جائے اور لوگ اس کے مطابق خود عمارت بنالیں، تو اس صورت میں بلاشبہ تعمیر کے ایک ایک جزء کی تفصیل ہم کو ملنی چاہیے۔ لیکن جب تعمیری ہدایات کے ساتھ ایک انجینئر بھی سرکاری طور پر مقرر کر دیا جائے اور وہ ان ہدایات کے مطابق ایک عمارت بنا کر کھڑی کر دے، تو پھر انجینئر اور اس کی بنائی ہوئی عمارت کو نظر انداز کر کے صرف نقشے ہی میں تمام جزئیات کی تفصیل تلاش کرنا، اور پھر اسے نہ پا کر نقشے کی ناتمامی کا شکوہ کرنا غلط ہے۔ قرآن جزئیات کی کتاب نہیں ہے بلکہ اصول اور کلیات کی کتاب ہے۔ اس کا اصل کام یہ ہے کہ نظام اسلامی کی فکری اور اخلاقی بنیادوں کو پوری وضاحت کے ساتھ نہ صرف پیش کرے بلکہ عقلی استدلال اور جذباتی اپیل، دونوں کے ذریعے سے خوب مستحکم بھی کر دے۔ اب رہی اسلامی زندگی کی عملی صورت، تو اس معاملے میں وہ انسان کی رہنمائی اس طریقے سے نہیں کرتا کہ زندگی کے ایک ایک پہلو کے متعلق تفصیلی ضابطے اور قوانین بتائے، بلکہ وہ ہر شعبۂ زندگی کے حدود اربعہ بتا دیتا ہے اور نمایاں طور پر چند گوشوں میں سنگ نشان کھڑے کر دیتا ہے جو اس بات کا تعین کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق ان شعبوں کی تشکیل و تعمیر کن خطوط پر ہونی چاہیے۔ ان ہدایات کے مطابق عملاً اسلامی زندگی کی صورت گری کرنا نبی ﷺ کا کام تھا۔ انہیں مامور ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ دنیا کو اس انفرادی سیرت و کردار اور اس معاشرے اور ریاست کا نمونہ دکھا دیں جو قرآن کے دیے ہوئے اصولوں کی عملی تعبیر و تفسیر ہو۔

ایک اور سوال جو بالعموم لوگوں کے ذہن میں کھٹکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو قرآن ان لوگوں کی انتہائی مذمت کرتا ہے جو کتاب اللہ کے آ جانے کے بعد تفرقے اور اختلاف میں پڑ جاتے ہیں اور اپنے دین کے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں، اور دوسری طرف قرآن کے احکام کی تعبیر و تفسیر میں صرف متاخرین ہی نہیں، ائمہ اور تابعین اور خود صحابہ تک کے درمیان اتنے اختلافات پائے جاتے ہیں کہ شاید کوئی ایک بھی احکامی آیت ایسی نہ ملے گی، جس کی ایک تفسیر بالکل متفق علیہ ہو۔ کیا یہ سب لوگ اس مذمت کے مصداق ہیں جو قرآن میں وارد ہوئی ہیں؟ اگر نہیں تو پھر وہ کون سا تفرقہ و اختلاف ہے جس سے قرآن منع کرتا ہے؟

یہ ایک نہایت وسیع الاطراف مسئلہ ہے جس پر مفصل بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے۔ یہاں قرآن کے ایک عامی طالب علم کی الجھن دور کرنے کے لیے صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ قرآن اس صحت بخش اختلاف رائے کا مخالف نہیں ہے جو دین میں متفق اور اسلامی نظام جماعت میں متحد رہتے ہوئے محض احکام و قوانین کی تعبیر میں مخلصانہ تحقیق کی بنا پر کیا جائے، بلکہ وہ مذمت اس اختلاف کی کرتا ہے جو نفسانیت اور کج نگاہی سے شروع ہو اور فرقہ بندی و نزاع باہمی تک نوبت پہنچا دے۔ یہ دونوں قسم کے اختلاف نہ اپنی حقیقت میں یکساں ہیں اور نہ اپنے نتائج میں ایک دوسرے سے

کوئی مشابہت رکھتے ہیں کہ دونوں کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا جائے۔ پہلی قسم کا اختلاف تو ترقی کی جان اور زندگی کی روح ہے۔ وہ ہر اس سوسائٹی میں پایا جائے گا جو عقل و فکر رکھنے والے لوگوں پر مشتمل ہو۔ اس کا پایا جانا زندگی کی علامت ہے اور اس سے خالی صرف وہی سوسائٹی ہو سکتی ہے جو ذہین انسانوں سے نہیں بلکہ لکڑی کے کندوں سے مرکب ہو۔ رہا دوسری قسم کا اختلاف، تو ایک دنیا جانتی ہے کہ اس نے جس گروہ میں بھی سر اٹھایا اس کو پراگندہ کر کے چھوڑا۔ اس کا رونما ہونا صحت کی نہیں بلکہ مرض کی علامت ہے، اور اس کے نتائج کبھی کسی امت کے حق میں بھی مفید نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں قسم کے اختلافات کا فرق واضح طور پر یوں سمجھیے کہ:

ایک صورت تو وہ ہے جس میں خدا اور رسول کی اطاعت پر جماعت کے سب لوگ متفق ہوں، احکام کا ماٰخذ بھی بالاتفاق قرآن اور سنت کو مانا جائے، اور پھر دو عالم کسی جزوی مسئلے کی تحقیق میں، یا دو قاضی کسی مقدمے کے فیصلے میں ایک دوسرے سے اختلاف کریں، مگر ان میں سے کوئی بھی نہ تو اس مسئلے کو، اور اس میں اپنی رائے کو مدار دین بنائے اور نہ اس سے اختلاف کرنے والے کو دین سے خارج قرار دے، بلکہ دونوں اپنے اپنے دلائل دے کر اپنی حد تک تحقیق کا حق ادا کر دیں، اور یہ بات رائے عام پر، یا اگر عدالتی مسئلہ ہو تو ملک کی آخری عدالت پر، یا اگر اجتماعی معاملہ ہو تو نظام جماعت پر چھوڑ دیں کہ وہ دونوں رایوں میں سے جس کو چاہیں قبول کریں، یا دونوں کو جائز رکھیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اختلاف سرے سے دین کی بنیادوں ہی میں کر ڈالا جائے، یا یہ کہ کوئی عالم یا صوفی یا مفتی یا متکلم یا لیڈر کسی ایسے مسئلے میں جس کو خدا اور رسول نے دین کا بنیادی مسئلہ قرار نہیں دیا تھا، ایک رائے اختیار کرے اور خواہ مخواہ کھینچ تان کر اس کو دین کا بنیادی مسئلہ بنا ڈالے، اور پھر جو اس سے اختلاف کرے اس کو خارج از دین و ملت قرار دے، اور اپنے حامیوں کا ایک جتھا بنا کر کہے کہ اصل امت مسلمہ بس یہ ہے اور باقی سب جہنمی ہیں، اور ہانک پکار کر کہے کہ مسلم ہے تو بس اس جتھے میں آ جاو ورنہ تو مسلم ہی نہیں ہے۔

قرآن نے جہاں کہیں بھی اختلاف اور فرقہ بندی کی مخالفت کی ہے اس سے اس کی مراد یہ دوسری قسم کا اختلاف ہی ہے۔ رہا پہلی قسم کا اختلاف، تو اس کی متعدد مثالیں خود نبی ﷺ کے سامنے پیش آ چکی تھیں، اور آپ نے صرف یہی نہیں کہ اس کو جائز رکھا، بلکہ اس کی تحسین بھی فرمائی۔ اس لیے کہ وہ اختلاف تو اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ جماعت میں غور و فکر اور تحقیق و تجسس اور فہم و تفقہ کی صلاحیتیں موجود ہیں، اور جماعت کے ذہین لوگوں کو اپنے دین سے اور اس کے احکام سے دلچسپی ہے، اور ان کی ذہانتیں اپنے مسائل زندگی کا حل دین کے باہر نہیں بلکہ اس کے اندر ہی تلاش کرتی ہیں، اور جماعت بحیثیت مجموعی اس زرّیں قاعدے پر عامل ہے کہ اصول میں متفق رہ کر اپنی وحدت برقرار

رکھے اور پھر اپنے اہل علم وفکر کو صحیح حدود کے اندر تحقیق واجتہاد کی آزادی دے کر ترقی کے مواقع بھی باقی رکھے۔

هٰذا ما عندی والعلم عند اللّٰه ، علیه توکلت والیه انیب

اس مقدمے میں تمام ان مسائل کا استقصا کرنا میرے پیش نظر نہیں ہے جو مطالعۂ قرآن کے دوران میں ایک ناظر کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان سوالات کا بیشتر حصہ ایسا ہے جو کسی نہ کسی آیت یا سورۃ کے سامنے آنے پر ذہن کو کھٹکتا ہے، اور اس کا جواب تفہیم القرآن میں برسرموقع دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا ایسے سوالات کو چھوڑ کر میں نے یہاں صرف ان جامع مسائل سے بحث کی ہے جو بحیثیت مجموعی پورے قرآن سے تعلق رکھتے ہیں۔ ناظرین کرام سے میری درخواست ہے کہ صرف اس مقدمے کو دیکھ کر ہی اس کے تشنہ ہونے کا فیصلہ نہ کر دیں، بلکہ پوری کتاب کو دیکھنے کے بعد اگر ان کے ذہن میں کچھ سوالات جواب طلب باقی رہ جائیں، یا کسی سوال کے جواب کو وہ ناکافی پائیں تو مجھے اس سے مطلع فرمائیں۔

السُّوَر

نمبر شمار	نام سورۃ	نمبر صفحہ
۱	الفاتحة	۳۹
۲	البقرة	۴۲
۳	ال عمران	۱۷۲
۴	النسآء	۲۳۷
۵	المآئدة	۳۲۲
۶	الا نعام	۳۸۴
۷	الاعراف	۴۵۳
۸	الانفال	۵۳۷
۹	التوبة	۵۶۸
۱۰	یونس	۶۲۹
۱۱	هود	۶۷۴
۱۲	یوسف	۷۱۹
۱۳	الرَّعد	۷۶۳
۱۴	ابراهیم	۷۸۶
۱۵	الحجر	۸۰۷
۱۶	النَّحل	۸۲۵
۱۷	بنی اسرآئیل	۸۷۳
۱۸	الکهف	۹۱۲
۱۹	مریم	۹۴۹
۲۰	طٰهٰ	۹۷۲
۲۱	الانبیآء	۱۰۰۹
۲۲	الحجّ	۱۰۴۳
۲۳	المؤمنون	۱۰۸۱
۲۴	النّور	۱۱۱۱

الاَجزآء

نمبر شمار		نمبر صفحہ	نمبر شمار		نمبر صفحہ
۱	الٓمٓ	۴۴	۱۰	واعلموا	۵۵۴
۲	سیقول	۹۳	۱۱	یعتذرون	۶۱۱
۳	تلک الرّسل	۱۴۷	۱۲	ومامن دآبّة	۶۷۷
۴	لن تنالوا	۲۰۵	۱۳	ومآابرّئ	۷۴۲
۵	والمحصنٰت	۲۵۴	۱۴	رُبَمَا	۸۰۸
۶	لایحبّ اللّٰه	۳۰۷	۱۵	سبحٰن الّذی	۸۷۵
۷	واذا سمعوا	۳۶۸	۱۶	قال الم	۹۳۹
۸	ولوانّنا	۴۲۴	۱۷	اقترب للنّاس	۱۰۱۱
۹	قال الملأ	۴۹۲	۱۸	قدافلح	۱۰۸۳

رموز اوقاف

قرآن مجید کی صحیح قراءت کے لیے خاص خاص علامتیں مقرر ہیں، جنھیں رموز اوقاف کہتے ہیں۔ ان رموز کی مفصل کیفیت درج ذیل ہے:

م = وقف لازم کی علامت ہے۔ اسے ترک کر دینے سے معنوں میں خلل پڑ جاتا ہے۔ یہاں ٹھیر جانا نہایت ضروری ہے، ورنہ عبارت کا مطلب منشائے الٰہی کے خلاف ہو جائے گا۔

ط = وقف مطلق کی علامت ہے۔ چوں کہ اس مقام پر بعد کی عبارت کو سابق عبارت کے ساتھ ملا کر پڑھنے کی وجہ نہایت ضعیف بلکہ ناپید ہوتی ہے۔ اس لیے احسن یہی ہے کہ یہاں ٹھیر کر آگے کی عبارت پڑھی جائے۔

ج = وقف جائز کی علامت ہے۔ یہاں ٹھیر جانا بہتر ہے مگر نہ ٹھیرنا بھی جائز ہے۔

ز = وقف مجوّز کی علامت ہے۔ یہاں نہ ٹھیرنا بہتر ہے اگرچہ ٹھیر جانا بھی جائز ہے۔

ص = وقف مرخّص کی علامت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ یہاں چاہیے تو ملا کر پڑھنا لیکن اگر پڑھنے والا تھک کر ٹھیر جائے تو کوئی حرج نہیں۔

ق = یہ قد قیل (کہا گیا ہے) یا قیل علیہ الوقف (کہا گیا ہے کہ اس مقام پر وقف ہے) کا مخفف ہے، یعنی بعض علماء کے نزدیک یہاں ٹھیر جانا جائز ہے، لیکن یہاں نہ ٹھیرنا بہتر ہے۔

لا = یہ لا وقف علیہ (اس مقام پر کوئی وقف نہیں) کا مخفف ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہاں ہرگز وقف نہ کیا جائے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اگر آدمی یہاں ٹھیر گیا ہو تو اسے عبارت پھر سے پڑھنی چاہیے۔

قف = یہ یوقف علیہ (اس مقام پر ٹھیرا جاتا ہے) کا مخفف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں ٹھیر کر آگے پڑھا جاتا ہے۔

سکتہ = پڑھنے والا سانس لیے بغیر یہاں ذرا ٹھیر جائے، مگر سانس نہ توڑے۔

وقفہ = لمبے سکتے کی علامت ہے۔ یعنی جتنی دیر میں سانس لیتے ہیں، پڑھنے والا اس سے کم ٹھیرے۔ علم قراءت کی اصطلاح میں سکتہ اور وقفہ قریب المعنی ہیں، لیکن سکتہ وصل سے قریب تر ہوتا ہے اور وقفہ وقف سے۔

صل = یہ قد یوصل (کبھی کبھی ملا کر پڑھا جاتا ہے) کا مخفف ہے، یعنی پڑھنے والا کبھی اس جگہ ٹھیر جاتا ہے، کبھی نہیں ٹھیرتا مگر یہاں وقف کرنا احسن ہے۔

صلی = یہ الوصل اولیٰ کا مخفف ہے۔ یعنی ملا کر پڑھنا بہتر ہے۔

جہاں ایک سے زیادہ علامتیں ہوں، وہاں اوپر کی علامت کا اعتبار ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک سے زیادہ علامتیں ایک سیدھ میں ہوں، تو آخری علامت کا اعتبار ہوگا۔

O مطلق آیت کی علامت ہے۔ جہاں فقط یہی علامت ہو، وہاں وقف کیا جائے۔ اگر آیت پر لا ہو، تو نہ ٹھیرنا بہتر ہے، مگر ضرورتاً ٹھیرا جائے تو مضائقہ بھی نہیں۔ قاریوں میں یہی مشہور ہے کہ نہ ٹھیرا جائے۔ اگر آیت پر لا کے سوا کوئی اور رمز وقف ہو، تو وقف و وصل کے لیے اسی علامت کا اعتبار ہوگا۔

∴ ∴ = اگر کوئی عبارت تین تین نقطوں کے درمیان گھری ہوئی ہو، تو پڑھنے والے کو اختیار ہے کہ پہلے تین نقطوں پر وقف کر کے دوسرے تین نقطوں پر وصل کرے۔ یا پہلے تین نقطوں پر وصل کر کے دوسرے تین نقطوں پر وقف کرے۔ اس قسم کی عبارت کو معانقہ یا مراقبہ کہتے ہیں۔

لاْ = جہاں الف پر علامت ° ہو وہاں الف کا تلفظ نہیں کیا جاتا۔